دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۳ ماہ صفر المظفر ۱۴۳۰ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۰۹ء عدد ۲

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

آپریشن کاسٹ لیڈ کی بائیس دن کی ہلاکت خیزی کے بعد اسرائیل نے یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کردیا۔ گویا یہ خوں ریز اور خوں آشام جنگ جن مقاصد کے لیے شروع کی گئی تھی وہ حاصل کر لیے گئے۔ اسرائیلی حکومت، فوج اور میڈیا کا یہی موقف ہے۔ ۱۸ رمہینے کی غیر انسانی ناکہ بندی سے تباہ حال غزہ کے نہتے باشندوں کے خلاف شرق اوسط کی سب سے بڑی فوجی طاقت کی ''بہادرانہ'' یلغار کی کامیابی کی خوشی میں اسرائیلی اخبارات میں چھپنے والے قصیدوں سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔ لیکن کیا حقیقت واقعہ یہی ہے۔ اس جنگ کا سب سے اہم مقصد جنوبی اسرائیل پر ہونے والے قسام راکٹوں کی بارش کو روکنا تھا۔ گذشتہ کچھ دنوں سے اسرائیل کا جنوبی علاقہ قسام راکٹوں کے بڑھتے ہوئے حملوں کی زد میں رہا ہے۔ لیکن اس تناظر میں یہ بھی یادرہنا چاہیے کہ ان راکٹوں کی تیاری میں بہت کچھ پیش رفت حاصل کرنے اور زیادہ مسافت طے کرنے کی اس کی بڑھتی ہوئی صلاحیت کے باوجود اسرائیل کے تباہ کن اسلحہ خانہ کے مقابلہ میں ان کی حیثیت پھلجھڑی سے زیادہ نہیں ہے۔ نفسیاتی نقطہ نظر سے تو ان کی اہمیت فلسطینیوں اور اسرائیلوں دونوں کے لیے بہت زیادہ ہے لیکن تباہی پھیلانے والے ایک ہتھیار کے طور پر کم ازکم اس مرحلہ میں ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ چنانچہ ان کو روکنے کے لیے اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنے وحشیانہ حملہ کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔ اس کے باوجود بھی واقعہ یہ ہے کہ اتنی غیر معمولی اور غیر متناسب قوت کے استعمال کے باوجود اسرائیل کی ہیبت ناک فوجی مشین اس کو روکنے میں یکسر ناکام رہی اور جنگ کے آخری لمحات تک یہ حملے جاری رہے۔ قسام کے حملے جنگ سے نہ روکے جاسکے۔ ان کو جنگ بندی ہی کے ذریعہ روکا جاسکا۔ اسی طرح جنگ کا ایک اہم مقصد غزہ میں حماس کی قوت اور مقبولیت ختم کرنا تھا تا کہ آزادی فلسطین کے لیے مسلح جدوجہد کا خاتمہ کیا جاسکے اور غزہ میں زمینی حقائق کو یکسر تبدیل کردیا جائے تا کہ آئندہ کسی ممکنہ امن مذاکرے میں حماس کا کوئی کردار باقی نہ رہ جائے اور ان کی جگہ محمود عباس کی کٹھ پتلی حکومت قائم کردی جائے۔ محمود عباس حماس کے ہاتھوں ذلت کے ساتھ غزہ سے نکلنے کے بعد اسرائیلی ٹینک پر سوار ہو کر وہاں واپس آنا چاہتے تھے۔ لیکن نتیجہ الٹا نکلا۔ حماس جنگ کی بھٹی سے اور مضبوط اور سرخ رو ہو کر نکلی۔ جس پامردی، استقلال، بہادری اور ایمانی بصیرت سے اس کے جیالوں نے اسرائیلی جارحیت کا مقابلہ کیا، اس سے اس کے قد میں بھی اضافہ ہوا اور اس کی مقبولیت میں بھی۔ عالمی سطح پر فلسطین کے لیے کسی پائدار حل کی تلاش میں حماس کی اساسی اہمیت کا اعتراف کیا گیا ہے اور پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ لوگوں نے اس سلسلہ میں اس کے اس کردار کو تسلیم کیا ہے۔ خود غزہ کے باشندوں کا حماس کے اوپر اعتماد بڑھا ہے، اس طرح اسرائیل اور اس کے ہم نواؤں کی یہ امید خاک میں مل گئی کہ جنگ کے نتیجہ میں ہونے والی ہمہ گیر تباہی اور بربادی غزہ کے باشندوں کو حماس کے خلاف صف آرا کردے گی۔ جنگ کے نتیجہ

میں جس فریق کی ساکھ پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہے وہ محمود عباس اور الفتح ہے۔ زندگی اور موت کی اس کشمکش میں جس طرح انہوں نے اسرائیل کا ساتھ دیا اس سے الفتح پر اعتبار اور اعتماد کو شدید نقصان پہنچا ہے۔

اس جنگ سے خود اسرائیل کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، اگرچہ امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک اس ٹریجڈی کے خاموش تماشائی بنے رہے لیکن دنیا بھر کے انصاف پسند عوام کے دلوں میں اس وحشیانہ بمباری کی لائی ہوئی بربادی کے دردناک مناظر کو دیکھ کر اسرائیل کے خلاف شدید نفرت اور غصہ کے جذبات پیدا ہوئے جن کا اظہار دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہونے والے عدیم المثال مظاہروں کی شکل میں ہوا۔ اس سے پہلے اسرائیل کے خلاف اس طرح کے مظاہروں کا نشان نہیں ملتا۔ اسی طرح پہلی مرتبہ دو ملکوں سے اس کے سفراء کا اخراج ہوا۔ گنجان آبادی والے علاقوں میں حقوق انسانی سے متعلق جماعتوں نے اسرائیل کو حقوق انسانی کی پامالی اور انسانیت کے خلاف جرائم کا مرتکب قرار دیا ہے اور یوگوسلاویہ کے انداز پر انٹرنیشنل کریمنل ٹریبونل فار اسرائیل (ICTI) کے قیام کا مطالبہ کیا ہے۔ ہر چند اسرائیل نے عالمی میڈیا کو غزہ جانے کی اجازت نہیں دی اور اس طرح اپنے جرائم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن غزہ کے صحافیوں کی جاں بازی نے ان کے دوسرے منصوبوں کی طرح اس منصوبہ کو بھی خاک میں ملا دیا اور اسرائیل کی بربریت اور سخت ترین حالات میں باشندگان غزہ کی پامردی اور شجاعت کے مناظر دنیا بھر میں دیکھے گئے۔ اسرائیل کی فرضی مظلومیت کا پردہ چاک ہو گیا اور اس کے ظلم اور بے رحمی کی صحیح شبیہ اس طرح کھل کر دنیا کے سامنے آگئی کہ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مٹھی بھر جاں بازوں کے ہاتھوں ہزیمت نے ۲۰۰۶ میں لبنان میں حزب اللہ کے ہاتھوں ہونے والی رسوائی کے داغ کو دھونے کے بجائے اور گہرا کر دیا ہے۔ اب اسرائیل منفی مہاجرت کے خطرہ سے دوچار ہے جس سے ریاست اسرائیل کا مستقبل خطرے میں ہے۔ زی لی لیونی اور ایہود بارک کا اس جنگ سے الکشن میں فائدہ اٹھانے کا منصوبہ بھی ناکام ہو گیا۔ اسرائیل کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ناکہ بندی اور جنگ سے بہادر اور غیور قوم کو شکست نہیں دی جا سکتی۔

غاصب اسرائیلی مملکت کے قیام کے بعد اس کو تسلیم کرنے والا پہلا مسلم ملک ترکی تھا۔ ترکی نے ۲۸ مارچ ۱۹۴۹ء کو اسرائیل کے ناجائز وجود کو تسلیم کر لیا تھا۔ خلافت کے خاتمہ کے بعد ترکی میں برسر اقتدار ٹولہ کی نظریاتی اساس کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں۔ سلطنت عثمانیہ سے عرب ممالک کی علاحدگی کی تکلیف دہ تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات مزید قابل فہم ہو جاتی ہے۔ اس وقت سے ترکی اور اسرائیل کے تعلقات میں بہت قربت رہی ہے۔ دوسرے مسلم ممالک کی طرح ترکی میں بھی یہودیوں کے ساتھ صرف انصاف اور رحم دلی کا نہیں بلکہ ہمیشہ فیاضی کا معاملہ کیا گیا ہے۔ صدیوں پہلے جب ۱۴۹۲ میں عیسائیوں پر اسپین میں عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا، جہاں وہ مسلم دور حکومت میں بڑے سکون اور فارغ البالی کی زندگی گذارتے رہے تھے، تو انہیں عثمانیوں ہی کے زیر سایہ پناہ ملی اور ڈیڑھ لاکھ کی کثیر تعداد میں انہیں قسطنطنیہ میں آباد ہونے کی

سہولت فراہم کی گئی۔ اس طرح ترکی کے ساتھ یہودیوں کے بہت قریبی تعلقات رہے ہیں، یہ ضرور ہے کہ جب سے جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی (AKP) برسر اقتدار آئی ہے اسلامی دنیا سے ترکی کے تعلقات میں ایک نئی گرم جوشی کی علامات واضح طور پر محسوس کی جارہی ہیں لیکن اس کے باوجود اسرائیل سے ترکی کے تعلقات حسب سابق قائم ہیں اور ان پر کوئی واضح منفی اثر نہیں پڑا۔ ۲۰۰۵ میں ترکی کے وزیراعظم طیب اردگان نے اسرائیل کا دورہ کیا۔ نومبر ۲۰۰۷ میں شمعون پیریز نے ترکی کا دورہ کیا، عبداللہ گل سے ملاقات کی اور پارلیمنٹ کو خطاب کیا۔ اور ابھی غزہ پر حملہ سے چند دن پہلے ۲۳ دسمبر کو اسرائیلی وزیراعظم اولمرٹ نے انقرہ کا دورہ کیا تھا۔ جن لوگوں کی اس خطہ کے معاملات پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ تعلقات ترکی کے مقابلہ میں اسرائیل کے لیے زیادہ اہم ہیں۔

لیکن شاید اب ترکی اور اسرائیل کے تعلقات میں روایتی گرم جوشی ایک قصہ پارینہ کی حیثیت اختیار کرنے والی ہے۔ غزہ کے خلاف اسرائیلی جارحیت نے ترکی اور اسرائیل کے ان مضبوط رشتوں میں گہری دراڑ ڈال دی ہے، ترکی میں بڑے پیمانے پر اس کے خلاف مظاہرے ہوئے اور ترک عوام نے اپنے مظلوم فلسطینی بھائیوں کے ساتھ یک جہتی اور اسرائیلی جارحیت کے خلاف شدید غم وغصہ کا اظہار کیا۔ اس وقت ترک معاشرہ جمہوری راستے سے تیز رفتار معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنے اسلامی تشخص کی بازیافت کے عمل میں مصروف ہے۔ یوروپی یونین کی رکنیت کی خواہش اور کوشش کے ساتھ شرق اوسط میں ایک نئے اور موثر کردار کی جستجو بھی اسی منصوبہ کا ایک حصہ ہے۔ شام اور اسرائیل کے درمیان مصالحت کی کوشش اور فلسطینیوں کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کرنے کے پیچھے بھی کسی حد تک یہی جذبہ کارفرما رہا ہے۔ غزہ پر اسرائیلی جارحیت نے اس نئے کردار کو نہایت قوت کے ساتھ بروئے کار لانے کا ایک نیا موقع فراہم کر دیا۔ چنانچہ ترک عوام کے ساتھ ترکی کی حکومت نے بھی اسرائیلی حملہ کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ مصر کے ذریعہ جنگ بندی کی کوششوں اور دوحہ کانفرنس میں ترکی نے موثر کردار ادا کیا ہے۔ Davos (ڈاواس) میں ورلڈ اکانامک فورم کی میٹنگ کے دوران ۱۹ رجنوری کو ترکی وزیراعظم طیب اردگان اور اسرائیل کے صدر شمعون پیریز کے درمیان ہونے والے تصادم میں ترک وزیراعظم کے چند الفاظ نے پوری صورت حال یکسر بدل دی ہے۔ اور باتوں کے علاوہ اس موقع پر ترک وزیراعظم نے اسرائیلی صدر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا

"When it clomes to killing you know very well how to kill"

ترک وزیراعظم کے اس جرأت مندانہ عمل نے انہیں صرف ترکی ہی میں نہیں بلکہ پوری عرب اور اسلامی دنیا میں ایک ہیرو کا مرتبہ عطا کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے اس موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اسے عثمانیوں کے ایک پوتے کا ردعمل بتایا۔ واضح طور پر ترکی اپنی عثمانی وراثت کی بازیافت کے لیے کوشاں ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ شرق اوسط کی صورت حال پر ترکی کے اس نو دریافت شدہ کردار کے صحت مند اور مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔

مقالات

پروفیسر مختار الدین احمد
کی عربی کی علمی و تحقیقی خدمات

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ

"ماہ فروری ۲۰۰۹ء سے مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کی وفات کا غم پھر سے تازہ ہو گیا، زیر نظر مقالہ مولانا کی غیر مطبوعہ تحریروں میں ہمیں ہاتھ لگا جو گو کہ معارف کے لیے نہیں لکھا گیا تھا، تاہم ان کی یاد کے طور پر ان کی یہ تحریر قارئین معارف کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے"۔

ملک کے مشہور اہل قلم اور ممتاز محقق پروفیسر مختار الدین احمد کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تصنیفی خدمات کا دائرہ وسیع اور کئی زبانوں کو محیط ہے، تاہم ان کی تلاش و تحقیق اور کد و کاوش کا خاص میدان اردو اور عربی زبانیں ہیں، اردو کے بلند پایہ ادیب و محقق اور ماہر غالبیات کی حیثیت سے ان کی عظمت کا سکہ جما ہوا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ عربی زبان کے متبحر عالم و محقق ہیں۔

وہ ایک ممتاز علمی و دینی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے والد بزرگوار ایک جید عالم دین اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے، مختار الدین صاحب نے ان سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر پٹنہ کی مشہور قدیم عربی درس گاہ شمس الہدیٰ میں درسیات کی تکمیل کی اور مدرسہ اکزامنیشن بورڈ سے مولوی، عالم، فاضل کے امتحانات پاس کیے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ فاضل کے امتحان میں وہ بہار اور اڑیسہ میں اور اسی طرح فاضل حدیث کے امتحان میں وہ صوبے بھر میں اول آئے۔

جدید تعلیم کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے تب بھی انہوں نے عربی کا دامن نہیں چھوڑا، ایم-اے عربی سے کیا اور اسی میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا اور پھر آکسفورڈ یونی ورسٹی سے سر ہملٹن

گب کی نگرانی میں ڈی فل کی ڈگری لی، تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے تو شعبہ عربی میں لکچرر ہوئے اور بالآخر پروفیسر اور صدر شعبہ ہو کر وظیفہ یاب ہوئے، مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونی ورسٹی کے قیام کا اعلان ہوا تو انہیں اس کا پہلا وائس چانسلر مقرر کیا گیا، ان کی نگرانی میں درجنوں طلبہ نے پی-ایچ، ڈی کی ڈگری لی اور ان کی صحبت و تربیت میں رہ کر سینکڑوں لوگوں میں علم و ادب اور عربیت کا اچھا مذاق پیدا ہوا۔

درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کرنے کے بعد ہی ان کا عرب ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا، اس سے ان کی عربیت کے ذوق کو اور جلا ملی، عراق، لبنان، شام اور ترکی کے علاوہ فرانس، جرمنی، ہالینڈ اور انگلستان وغیرہ کے علمی سفر کیے اور جہاں گئے وہاں کے کتب خانوں کو کھنگالا اور ان کے مطبوعات و مخطوطات کا بہ غور مطالعہ کیا، مخطوطات سے ان کو خاص شغف ہے، اب بھی عرب ملکوں کے علمی سمیناروں میں شریک ہوتے ہیں، وہ شرق اوسط کی کئی علمی اکیڈمیوں کے حیاتی رکن بھی ہیں، دمشق کی مجمع اللغۃ العربیۃ کی طرز پر انہوں نے المجمع العلمی الہندی قائم کی اور مجلّہ مجمع اللغۃ دمشق کی طرح ایک مجلۃ المجمع الہندی علی گڑھ سے ۱۹۱۹ء میں نکالا جسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔

غرض مختار الدین احمد صاحب کو اپنی پوری علمی و تعلیمی زندگی میں اصل سروکار عربی زبان سے رہا اور وہ مدت العمر اسی میں تصنیف و تالیف اور تحقیق و جستجو کرتے رہے، عربی میں ان کے گوناگوں علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند نے انہیں سرٹی فیکٹ آف آنر عطا کیا۔

عربی زبان و ادب سے متعلق پروفیسر مختار الدین احمد کے علمی و تحقیقی کام عربی کے علاوہ اردو اور انگریزی زبانوں میں بھی ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے ان کے تنوع کا اندازا اور حسب ذیل نوعیتیں سامنے آتی ہیں:

۱-عربی زبان کے ممتاز اور مایۂ ناز مصنّفین و اہل قلم اور نام ور اصحاب شعر و ادب پر مضامین لکھے جن میں ان کے حالات و سوانح اور خدمات اور کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۲-گوناگوں اوصاف و کمالات کے مالک شعرا، ادبا اور مصنّفین کو اگر موضوع بنایا ہے تو پہلے ان کے حالات تلاش و تفحص سے لکھے ہیں پھر ان کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی ایک یا

نمایاں پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

۳- کسی مصنف، ادیب اور شاعر کے حالات کد و کاوش سے لکھنے کے بعد اس کی کسی خاص قابل ذکر تصنیف پر اپنی گفتگو اور بحث کے نتائج پیش کیے ہیں جو تحقیق و تدقیق کا خاص نمونہ اور معلومات سے پر ہے۔

۴- کسی منثور یا منظوم تصنیف کی دریافت اور اس کے متن کی اپنے فاضلانہ مقدمہ اور تحقیق و تحشیہ کے بعد اشاعت کی ہے۔

۵- عربی زبان کی کسی اہم اور عظیم الشان مطبوعہ تصنیف کا مبسوط تعارف کرایا ہے جس میں دوسری زبانوں میں اس کے تراجم اور مختلف اشاعتوں کی تعداد وغیرہ کا ذکر ہے۔

۶- صاحب کمالات اور مشہور مصنف کے نادر و نایاب مخطوطے کا تعارف کرایا ہے۔

۷- کسی اہم کتب خانے کے کسی نادر نسخے کا تعارف کرایا ہے۔

۸- کسی گم شدہ اور ناپید کتاب کی تلاش و دریافت کر کے اس کا تعارف کرایا ہے۔

۹- اپنے اساتذہ اور معاصرین کی شائع کردہ کسی نادر و نایاب تصنیف پر بڑا عالمانہ تبصرہ کیا ہے۔

۱۰- جو کتابیں اب معدوم ہیں اگر وہ مکمل یا ان کے کچھ اجزا کسی کتاب میں انہیں نظر آئے تو ان کو شائع کیا ہے یا دریافت شدہ کی روشنی میں دوسرے مراجع و مصادر کی مدد سے اس پر مضمون لکھا اور اس کا مفصل تعارف کرایا ہے۔

۱۱- کسی بڑے مصنف کی ایک یا چند کتب جو عام لوگوں کی دست رس میں نہ تھیں ان کا مبسوط و مفصل تعارف کرایا ہے۔

۱۲- کسی مصنف کے حالات کے کسی اہم اور مستند ماخذ کی نشان دہی کی ہے۔

۱۳- کسی اچھے اور مشہور شاعر کے کچھ غیر مطبوعہ اشعار کو دریافت کر کے ان پر مفصل مقالہ لکھا ہے۔

۱۴- اپنے استاذ شیخ عبدالعزیز میمنی کے خطوط اور تقاریر کو اپنے مقدمہ و حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۱۵-عربی کے بعض کبار مصنفین وادبا سے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ کیا ہے۔
۱۶-عربی کے معروف اساتذہ، مصنفین اور محققین کی وفات پر مضامین لکھے ہیں۔

ان شقوں اور نوعیتوں پر تامل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے گھسے پٹے اور پامال موضوعات پر قلم نہیں اٹھایا ہے، انہیں متنوں کی تحقیق وتدوین سے زیادہ دل چسپی ہے اور اس کے لیے انہوں نے بلند پایہ اور معیاری کتابوں کا انتخاب کیا ہے، دراصل غیر معروف یا کم معروف مصنّفین وشعرا اور نادر ونایاب متون کی دریافت، تلاش وجستجو اور پھر تحقیق وتحشیہ کے بعد ان کی اشاعت مختار الدین احمد صاحب کا بڑا کارنامہ ہے، متون کی ترتیب وتدوین اور تنقید وتحقیق کا کام جس دیدہ ریزی اور سلیقے سے کرتے ہیں، اس کی مثال کم ملے گی، مخطوطہ شناسی میں بھی ان کا پایہ بہت بلند ہے، ہندو پاک، شرق اوسط اور یورپ کے ملکوں کے اکثر کتاب خانوں کے اہم، کم یاب اور نادر مخطوطات سے ان کو بڑی واقفیت ہے، اس لیے جب کوئی گراں بہا اور نادر مخطوطہ ان کے ہاتھ لگتا ہے تو اسے مرتب ومدون کر کے شائع کرنا وہ اپنا علمی وادبی فرض سمجھتے ہیں اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کی تحقیق وتلاش اور جستجو کا اصل میدان عربی زبان وادب ہے، جس کی متعدد نادر ونایاب کتابوں کو تحقیق وتحشیہ کے جملہ لوازم کے ساتھ انہوں نے شائع کیا ہے، ذیل میں ان کی ایڈٹ کی ہوئی دو کتابوں کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا اور بقیہ کے اجمالی تعارف ہی پر اکتفا کیا جائے گا۔

۱- المختار من شعرا بن الدمینة

ابن الدمینہ کے اصل اشعار کے انتخاب واختیار سے پہلے فاضل محقق کی تمہید کتاب میں شامل ہے، پھر انہوں نے پہلے شاعر ابن الدمینہ کے حالات تلاش وتفحص سے لکھے ہیں، اس کے بعد شاعر کے کلام کا انتخاب کرنے والے خالدیین کے حالات دیے ہیں، ہم پہلے تمہید کا جائزہ لیتے ہیں جس میں اس انتخاب کی جمع وترتیب اور اشاعت کی روداد اور اس کی قدر وقیمت اور ضرورت واہمیت بیان کی گئی ہے۔

تمہید: پروفیسر مختار الدین احمد نے ۱۹۵۰ء میں الاستاذ عبدالعزیز المیمنی صدر شعبہ عربی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی نگرانی میں صدر الدین علی بن ابی الحسن البصری کی الحماسة

البصریۃ کی تصحیح و تعلیق کا کام شروع کیا تھا، اس سلسلے میں مطالعہ و تحقیق اور کتابوں سے مراجعت کے لیے میمنی صاحب کے ذاتی کتب خانے میں ان کو گھنٹوں بیٹھنے اور اس کے نوادر کو دیکھنے کا موقع ملتا تھا، چنانچہ اسی زمانے میں الاستاذ کے ذخیرہ کتب میں سے بعض کتابوں کی نقل اس لیے لی تھی کہ آیندہ ان کو شائع کریں گے، مثلاً مراتب النحویین لابی الطیب اللغوی وغیرہ، ان ہی نقل کردہ کتابوں میں خالدیین کی الاشباہ والنظائر من اشعار المتقدمین والجاھلیۃ والمخضرمین کا وہ حصہ بھی تھا جس میں عبیداللہ بن الدمینہ کے حالات واشعار درج تھے، اس وقت اس کے دیوان کا ایک پرانا اور سقیم مصری ایڈیشن متداول تھا، اس لیے مختار الدین صاحب کو ابن الدمینہ کے اشعار کا مجموعہ مرتب کر کے شائع کرنے کا خیال ہوا۔

۱۹۵۳ء میں تین سال کے لیے وہ شرق اوسط اور مغربی یورپ کے علمی سفر پر تشریف لے گئے تو قاہرہ میں الاشباہ والنظائر اور ابن الدمینہ کے دیوان کے نسخوں کے مطالعے کا موقع ملا تو پھر اس کی اشاعت کا خیال تازہ ہوگیا لیکن اس زمانے کے دوسرے علمی کاموں نے اس کا موقع نہیں دیا۔

۱۹۶۲ء میں پھر اشاعت کا خیال دامن گیر ہوا اور کچھ اجزا کمپوز بھی کرا لیے تھے کہ دیوان ابن الدمینہ کا ایک نیا ایڈیشن ان کی نظر سے گذرا جس کو الاستاذ راتب النفاخ نے بڑی محنت و کاوش سے مرتب کر کے شائع کیا تھا، اس سے مختار الدین صاحب کو متن کی تصحیح اور بعض دوسرے امور میں بڑی مدد ملی، انہوں نے خود بھی ابن الدمینہ کے اشعار بڑی تلاش و محنت سے ممکنہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ مصادر سے اکٹھا کیے تھے اور اختلاف نسخ بھی درج کیے تھے، یہی سارے مصادر استاذ نفاخ کے سامنے بھی رہے تھے، اس لیے ان کے شائع کردہ دیوان کے مطالعے کے بعد مختار الدین صاحب نے اپنے مجموعے سے تخریج اشعار اور اختلاف نسخ کے مباحث اور بعض دوسرے امور نکال کر اب دوسرے مصادر کے بجائے دیوان کے نئے ایڈیشن کے حوالے دیے اور اس ایڈیشن اور الاشباہ کی روایتوں کے فرق کو ظاہر کر دیا، اس کے علاوہ خالدیین نے الاشباہ والنظائر میں ایسے اشعار و قطعات درج کیے تھے جو دیوان ابن الدمینہ کے قلمی نسخوں میں نہیں ملتے تھے، ایسے اشعار و قطعات پر انہوں نے امتیاز کے لیے ستارے کا نشان لگا دیا تا کہ معلوم ہو جائے

کہ یہ اشعار دیوان میں موجود نہیں ہیں، اس لیے ان کی اہمیت ظاہر ہے۔

الاشباہ میں ابن الدمینہ کے اشعار اور ان سے متعلق دوسرے معلومات ایک جگہ تفصیلی طور پر درج ہیں اور اس کے بعد اس کی وفات کی تفصیل ملتی ہے، فاضل محقق کو اس کتاب میں اور دوسرے مختلف مقامات پر ابن الدمینہ کے جو اشعار ملے ہیں، وہ سب واقعات قتل سے پہلے درج کردیے ہیں تاکہ ابن الدمینہ کے سارے مندرج اشعار ایک جگہ جمع ہوجائیں۔

مختار الدین صاحب نے اس انتخاب و اختیار کی اشاعت کے فوائد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے لوگوں کو ابن الدمینہ کے اشعار کے مطالعے کا موقع ملے گا اور وہ اس عہد کے ایک نغز گو شاعر کے نتائج فکر سے واقف ہوں گے۔

یہ انتخاب چوتھی صدی ہجری کے جن دو بلند پایہ ادیبوں اور مشہور شاعروں نے کیا ہے، انہوں نے اس کے علاوہ بھی متعدد شعرا کے دواوین کے انتخابات مرتب کیے تھے، اس طرح ایک ہی مجموعہ کے مطالعے سے بہ یک وقت ابن الدمینہ کے اشعار اور خالدیین کا انتخاب دونوں قارئین کے سامنے آجائیں گے اور وہ اندازا کرلیں گے کہ خالدیین کے نزدیک ابن الدمینہ کے پسندیدہ اشعار کیا تھے اور ان کے ضمن میں انہوں نے کیا کیا ادبی و شعری نکات اور دوسرے فوائد تحریر کیے ہیں۔

ابن الدمینہ: تمہید کے بعد ابن الدمینہ کے حالات کا حصہ آتا ہے، اس میں پہلے صدی وار، ابن الدمینہ کے بارے میں اطلاعات کے مآخذ کا تذکرہ ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

تیسری صدی ہجری میں زبیر بن بکار (م ۲۵۶ھ) اور ابن طیفور (م ۲۸۰ھ) نے ابن الدمینہ پر مستقل کتابیں لکھی تھیں مگر وہ دست برد حوادث سے محفوظ نہیں رہیں، البتہ اول الذکر کی کتاب اخبار الدمینہ کے اقتباسات و ملخصات تیسری اور چوتھی صدی ہجری کی متعدد کتابوں میں ملتے ہیں اور یہی ابن الدمینہ کے حالات زندگی کی واقفیت کے لیے سنگ بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔

مختار الدین احمد صاحب نے اس صدی کی چار اور کتابوں کے نام لکھے ہیں، ان میں دو محمد بن حبیب (م ۲۴۵ھ) کی ہیں، پہلی من نسب الی امه من الشعراء میں ابن الدمینہ

کے حالات اور دوسری اسماء المغتالین من الشعراء میں اس کے قتل واسباب قتل پر مفصل بحث ہے، ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ) نے الشعر و الشعراء میں اس کا ترجمہ درج کیا ہے مگر اسے اسقام واوہام سے خالی نہیں بتایا ہے، البتہ اسی صدی کے آخر کے ابوالعباس ثعلب (م ۲۹۱ھ) کے متعلق لکھا ہے کہ "اس نے ابن الدمینہ کا دیوان پہلی مرتبہ مرتب کیا اور اس پر ایک مقدمہ لکھا، دیوان کی یہی روایت محفوظ ہے"۔

چوتھی صدی ہجری میں ابن الدمینہ کی طرف اعتنا کرنے والوں میں ابوالفرج اصفہانی (م ۳۵۶ھ) اور خالدیین یعنی ابوبکر محمد (م قریبا ۳۸۰ھ) اور ابوعثمان سعید (م ۴۰۰ھ) کا نام لیا ہے لیکن اول الذکر کی کتاب الاغانی کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ زیادہ تر زبیر بن بکار، ابوعبیدہ (م ۲۱۰ھ) اور ابن الاعرابی (م ۲۳۱ھ) کی روایات سے ماخوذ اور اپنے سے پہلے کی تصانیف سے منقول ہے، خالدی برادران کا ماخذ بھی ابن بکار کی کتاب ہے، اس لیے ایک آدھ بات کے سوانئی معلومات مفقود ہیں۔

اسی صدی میں ابوالفرج الوشا (م ۳۳۵ھ) کی کتاب الموشیٰ اور ابن عبدربہ کی العقد الفرید کے بارے میں لکھا ہے کہ ان میں ابن الدمینہ کا ذکر ملتا ہے اور ابن عبدربہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اس کے وطن کا ذکر کیا ہے گو وہ اس میں جادۂ صواب سے ہٹ گئے ہیں۔

پانچویں صدی میں صرف ابوعبید البکری (م ۴۸۷ھ) کی تصنیف اللآلی میں دو جگہ ابن الدمینہ کا ذکر ہے، اس کی اولیت یہ ہے کہ اس نے شاعر کا سلسلہ نسب بھی لکھا ہے اور اس کے زمانے کی تعیین کی کوشش کی ہے مگر وہ شدید مغالطے کا شکار ہو گئے ہیں۔

ساتویں صدی میں ابن الدمینہ کے متعلق کسی اہم اور قابل ذکر اطلاع کی نفی کی ہے مگر چھٹی صدی ہجری کا سرے سے کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔

آٹھویں صدی کے ایک مصنف ابن فضل اللہ العمری (م ۷۴۹ھ) کی کتاب مسالک الابصار میں کام کی بات کی کمی اور عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کی زیادتی کی شکایت کی ہے اور دوسرے مصنف ابن شاکر الکتبی (م ۷۶۴ھ) کی عیون الاخبار میں نئی اور چونکا دینے والی باتیں ہونے کا اعتراف کیا ہے مگر حوالے اور سند کے بغیر اس کتاب کی سب سے

دل چسپ بات اس کو قرار دیا ہے کہ ابن الدمینہ مخضرمی الدولتین تھے۔

نویں صدی ہجری میں اگر کسی نے ابن الدمینہ کی طرف توجہ کی ہے تو مختار الدین کو اس کا علم نہیں ہوسکا ہے، لکھا ہے کہ دسویں صدی میں سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی شرح شواھد المغنی اور عبدالرحیم العباسی (م ۹۶۳ھ) کی معاھد التنفیص میں ابن الدمینہ کے حالات واشعار درج ہونے کے باوجود کام کی باتوں کا فقدان ہے، سیوطی نے غالباً البکری کا چربا اڑایا ہے اور العباسی نے تقریباً سب کچھ کتاب الاغانی سے لے کر درج کردیا ہے۔

گیارہویں صدی میں عبدالقادر البغدادی (۱۰۹۳ھ) کی شرح شواھد المغنی کو قابل ذکر بتایا ہے مگر تحقیق و اضافہ سے عاری اور اس کو پہلے کے مصنّفین کی صدائے بازگشت قرار دیا ہے۔

غرض ابن الدمینہ کے متعلق تیسری صدی ہجری سے گیارہویں صدی ہجری تک کی کتب مآخذ کا جائزہ لینے کے بعد وہ حسب ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں۔

۱- ابن الدمینہ کے حالات و اشعار کے لیے بنیادی ماخذ تیسری اور چوتھی صدی کی تصانیف ہیں۔

۲- ان کتابوں کی اہمیت صرف قدامت ہی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس دور کے مصنّفین کی معلومات میں سند کا اہتمام والتزام اور اقوال واخبار کے قائلین کا ذکر ہے۔

۳- سند کے التزام کی وجہ سے بہت سے معاملات میں اختلاف کی صورت میں صحیح رائے قائم کرنے اور کسی ایک کے قول کو دوسرے کے قول پر ترجیح دینے میں آسانی ہوتی ہے۔

۴- چوتھی صدی کے بعد کی کتابوں کو اصل ماخذ کے طور پر اس لیے استعمال نہیں کرسکتے کہ ان کتابوں کے مندرجات قدیم کتابوں سے ماخوذ و مقتبس ہیں، اگر ان میں کوئی جدت و انفرادیت ہے تو وہ باطل، مشکوک اور ناقابل اعتماد ہے۔

مآخذ و مراجع کا یہ جائزہ فاضل مرتب و محقق کی وسعت مطالعہ، دقت نظر، اصابت فکر و رائے، حزم واحتیاط، تلاش و جستجو اور تحقیق و کاوش میں استقصا کا ثبوت ہے۔

ابن الدمینہ کے حالات لکھنے میں بھی بڑی دیدہ ریزی اور محنت کی گئی ہے، پہلے اس کا نام،

کنیت، اس کے آباواجداد کے اسما درج کیے ہیں پھر ماں کے قبیلہ کا نام اور اس کی بعض خصوصیات بیان کی ہے، ان امور کے متعلق مورخین کے اختلافات کا تذکرہ اور صحیح و مرجح قول کو مع وجہ ترجیح بیان کیا ہے، پھر ولادت کا سال تحریر کیا ہے اور ابتدائی حالات کو پردۂ خفا میں بتاتے ہوئے قیاس و قرینے سے اس کی شخصیت کے تشکیلی عناصر وعوامل طے کیے ہیں اور یہ خاص بات بتائی ہے کہ:

"قیاس غالب ہے کہ اس نے قرآن کا مطالعہ کیا تھا، وہ رب محمد و بلال اور رب الطور و الانفال کی قسم کھاتا تھا، اس کے ثبوت میں حاشیے میں اس کے دو شعر نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ اس کے اشعار میں استغفار، توبہ، حشر ونشر اور یوم الحساب کا ذکر بھی ملتا ہے"۔

ابن الدمینہ کی جوانی کے دو خاص قابل ذکر واقعے یہ لکھے ہیں:

۱-رہ زنی، گرفتاری اور قید۔ ۲-عربی محبوباؤں سے عشق۔

دونوں باتوں کے ثبوت وسند کے لیے اس کے بعض سوانح نگاروں کے نام اور خود شاعر کے اشعار پیش کیے ہیں، اس کی داستان عشق و محبت کسی قدر تفصیل سے سنائی گئی ہے اور کئی محبوباؤں کے نام بھی لکھے ہیں مگر چار حماء، امیمہ، سلمی اور ام عمرو کا کچھ حال اور ان پر ابن الدمینہ کے فریفتہ ہونے کی شہادت میں اس کے اشعار کے علاوہ دوسرے مصادر کو بھی پیش کیا ہے۔

ابن الدمینہ کے وطن کے بارے میں ابن عبدربہ اور شاکر الکلتبی کی رائے کو مسترد قرار دیتے ہوئے استاذ النفاخ کے اس خیال کو قرین قیاس بتایا ہے کہ حجاز کے جنوب میں یمن کے قریب اس کا وطن تھا، یہیں اس کا قبیلہ خثعم آباد تھا اور ابن الدمینہ کی ولادت، نشو ونما اور زندگی کا زیادہ حصہ بھی یہیں گزرا اور وہ یہیں کی خاک کا پیوند ہوا۔

ابن الدمینہ کا زمانہ متعین کرنے میں ان کو اس لیے دشواری پیش آئی ہے کہ قدیم مآخذ میں اس کی صراحت نہیں ملتی اور کچھ لوگوں نے محض ظن وقیاس سے کام لیا، اس بارے میں مختلف آرا کا ذکر کر کے ان کی مدلل تردید کی ہے اور کہیں کہیں دل چسپ تبصرے بھی کیے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

> "سب سے دل چسپ بات جرجی زیدان نے تاریخ الآداب اللغۃ العربیۃ میں لکھی ہے کہ وہ جاہلی شاعر تھا، رب محمد و بلال اور رب الطور و الانفال کی قسم کھانے والا جاہلی کیوں کر ہو سکتا ہے"۔

بالکل آخر میں اپنی یہ رائے تحریر کی ہے جو مقدمہ دیوان ابن الدمینہ مرتبہ الاستاذ راتب النفاخ سے ماخوذ وملخص ہے:

''ابن الدمینہ کے متعلق سارے مصادر تاریخ جو ہمیں مل سکے ہیں، انہیں سامنے رکھا جائے تو ان کا خلاصہ یہ ہوگا کہ ابن الدمینہ نے کم از کم نصف صدی کے قریب عصر عباسی میں زندگی گزاری، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ شاعر صدر اسلام کے عہد کا نہیں ہوسکتا جیسا کہ ابوعبید البکری اور ان کے متبعین کا خیال ہے اور یہ بھی بعید ہے کہ وہ ''مخضرمی الدولتین'' ہو جیسا کہ ابن شاکر نے لکھا ہے، اگر اس نے کچھ زمانہ عہد اموی کا پایا ہے تو گمان غالب یہ ہے کہ یہ اس کے بچپن کا زمانہ ہوگا اور اسے عباسی محدث شاعر کہنا ہر طرح بجا اور قرین صواب ہوگا''۔

آخر میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ ابن الدمینہ کے دیوان کے چار قلمی نسخے دریافت ہوئے ہیں جو مکتبہ عاشر آفندی ترکیا، کتب خانہ شنقیطیہ، دار الکتب المصریہ اور کتب خانہ تیموریہ میں محفوظ ہیں اور اول الذکر کے علاوہ اب باقی سب نسخے دار الکتب المصریہ میں آگئے ہیں، ان میں اہم نسخہ اول الذکر ہے جو ۵۴۶ھ کا مکتوبہ ہے جس کے کاتب رئیس الحکما ابن التلمیذ النصرانی (۴۶۵-۵۶۰) اور ابن ساطور النصرانی سعد بن عبداللہ بن علی ہیں، یہ نسخہ دار الکتب النظامیہ کے احمد بن علی الشمعی کے ۴۳۱ھ میں لکھے گئے ایک نسخہ سے مقابلہ شدہ ہے، فاضل محقق اسی نسخے کو سب سے قدیم اور صحت کے لحاظ سے سب سے اہم بتاتے ہیں اور بقیہ نسخوں کو اس کی نقل در نقل اور زمانہ حال کے لکھے ہوئے بتاتے ہیں۔

مختار الدین احمد صاحب نے دیوان کے دو مطبوعہ نسخوں کا ذکر بھی کیا ہے، ایک مطبع منار قاہرہ سے ۱۳۳۷ھ میں محمد الہاشمی البغدادی نے نکالا تھا اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی قاہرہ سے زمانہ حال ۱۹۶۰ء میں استاذ احمد راتب النفاخ نے شائع کیا ہے، اس کے متن کی بنیاد نسخہ عاشر پر ہے اور اس میں نسخہ شنقیطی سے بھی بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے، فاضل مرتب کے نزدیک یہ بڑا عالمانہ ہے، اس میں اصل نسخوں میں جو تصحیفات واغلاط ہیں، ان کی صحت بڑی محنت سے کی ہے، قطعات مشہور ومتداول کتب میں جہاں جہاں ملتے ہیں ان کی تخریج کی ہے اور اختلاف روایت درج کیا ہے، اشعار کی شرح کی ہے اور ضمیمے میں ابن الدمینہ کے وہ اشعار بھی تلاش

کر کے درج کر دیے ہیں جو اصل دیوان میں نہیں ملتے لیکن دوسرے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مصادر میں موجود ہیں۔

خالدیین : شاعر ابن الدمینہ کے حالات تحریر کرنے کے بعد اپنی کتاب میں اس کے دیوان کا انتخاب کرنے والے خالدیین کے سوانح حیات پیش کیے ہیں، مختارالدین احمد صاحب کی تلاش و تحقیق اور محنت و کاوش کا اندازا کرنے کے لیے اس کا بھی تجزیہ کیا جاتا ہے۔

فاضل محقق مختلف مصادر کی چھان بین کر کے بتاتے ہیں کہ دونوں بھائیوں کا نام ابوبکر محمد اور ابوعثمان سعید تھا، یہ دونوں بھائی موصل کے قریب ایک گاؤں خالدیہ کے رہنے والے تھے، اسی کی طرف نسبت کی وجہ سے وہ خالدیین کہلاتے ہیں، بعض لوگوں کے خیال میں یہ ان دونوں کے خالد نام کے بزرگ کی طرف نسبت ہے، جس کا نام خالد بن منبہ عبدی تھا، محقق گرامی ان دونوں کے سنین ولادت کا تعین نہیں کر سکے ہیں لیکن چوں کہ خالدیین نے چوتھی صدی ہجری کے ربع اول کے بعض مصنفین و روات سے روایتیں کی ہیں، اس سے وہ قیاس کرتے ہیں کہ دونوں بھائی تیسری صدی کے اواخر یا چوتھی صدی کے پہلے عشرے میں پیدا ہوئے ہوں گے، ان میں ابوبکر محمد بڑے تھے اور ۳۸۰ھ میں فوت ہوئے، چھوٹے ابوعثمان سعید کا سال وفات لگ بھگ ۴۰۰ھ بتایا ہے، بچپن میں تعلیم اور اساتذہ کے ذکر سے مآخذ خاموش ہیں، تاہم عنفوان شباب میں طلب علم کے لیے بغداد جانے کا محقق نے قیاساً ذکر کیا، اس کے بعد کی زندگی کے تین دور بتائے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

دونوں بھائی اپنی زندگی کے پہلے دور میں سیف الدولہ کے دربار میں داخل ہوئے، دوسرے دور میں اس کے دربار میں ان کا اثر و رسوخ بڑھا اور ابو اسحاق صابی سے ان کے تعلقات ہوئے اور وزیر مہلبی کے حاشیہ نشینوں میں داخل ہوئے، اس زمانے میں سیف الدولہ کے دربار میں اہل شعر و ادب کا جمگھٹ لگا رہتا تھا، متنبی بھی وہاں موجود ہوتا تھا، خالدیین کو شعرا و ادبا کی نوک جھونک سے فائدہ ہوا ہوگا، اپنی جودت طبع، ذکاوت اور شعری ذوق کی بنا پر بہت جلد مقرب بارگاہ ہو گئے اور کتاب خانے کے ناظم مقرر ہوئے، شاہی انعامات سے بھی فیض یاب ہوئے مگر آخر میں مورد عتاب ہو گئے تھے۔

پروفیسر مختارالدین احمد نے خالدیین اور سری الرفاء کی چشمک کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، ان کے جھگڑے میں شام و عراق کے لوگ دو گروہوں میں منقسم ہوگئے تھے، ابواسحاق صابی دونوں بھائیوں کے ساتھ اور ان کے بڑے معاون تھے، سری الرفاء نے دونوں بھائیوں پر سرقہ کا الزام بھی لگایا تھا، جس کی حقیقت ثعالبی کے ایک بیان کی روشنی میں فاضل محقق نے یہ بیان کی ہے:

> ''سری الرفا کشاجم کا دیوان اجرت پر نقل کیا کرتا تھا، اپنے نقل کیے ہوئے نسخوں میں وہ خالدیین کے اچھے اچھے شعر درج کردیا کرتا تھا، تاکہ مخطوطے کا حجم بڑھے اور اجرت زیادہ ملے، دوسرا مقصد یہ حاصل ہو کہ اپنے رقیب خالدیین کے سرقہ شعری پر مہر تصدیق ثبت کردے، اس طرح جب لوگ وہ اشعار جنہیں خالدیین اپنا زائیدۂ فکر بتاتے ہیں، دیوان کشاجم کے متعدد نسخوں میں موجود پائیں گے تو یہی سمجھیں گے کہ یہ سب اشعار دراصل کشاجم کے ہیں اور خالدیین سرقہ کر کے انہیں اپنی طرف منسوب کرتے ہیں''۔

دونوں بھائیوں کے اشتراک اور پیوستگی کے متعلق لکھا گیا ہے کہ ادبی تاریخوں میں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے کہ شعر گوئی، اشعار کی تفسیر و تشریح، جمع و انتخاب، غرض کہ سارے ادبی کاموں میں دونوں برابر کے شریک ہوں، کہیں آنے جانے، سفر و حضر، دربار میں داخل، عہدوں پر فائز ہونے، رنج و نشاط، غرض زندگی کے ہر موڑ پر ایک دوسرے کے ساتھی اور شریک نظر آتے ہیں، اسی لیے ادیبوں اور نقادوں کو ان میں موازنہ اور ایک کو دوسرے سے افضل قرار دینے میں بڑی حیرانی اور دشواری پیش آئی ہے، جس پر صابی نے ایک قطعہ بھی لکھا تھا۔

مورخین نے خالدیین کی جن کتابوں کا ذکر کیا ہے، پروفیسر مختارالدین احمد نے تلاش و جستجو سے ان کے ناموں کو اکٹھا کردیا ہے اور جن کے ناموں میں مورخین کا اختلاف ہے، انہوں نے ان کے صحیح نام کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور جو کتابیں دو ناموں سے موسوم ہیں ان کی صراحت نقد کے ساتھ کی ہے، پھر اس کے نسخے کہاں کہاں ملتے ہیں اور وہ مکمل یا بعض حصے کب اور کہاں سے شائع ہوئے ہیں، کن کن مصنفین اور مورخین نے کس کتاب کا ذکر کیا ہے اور کس نے نہیں کیا ہے، اس کے متعلق اگر مورخین کا اختلاف ہوتا ہے تو اس کا تذکرہ بھی کردیتے ہیں،

جن کتابوں کے کسی نسخے کا علم فاضل محقق کو نہیں ہوسکا ہے اس کی بھی صراحت کردی ہے، خالدیین کی کتابوں کی فہرست کے آخر میں اس کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے چھ شعرا کے کلام کے انتخابات تیار کیے تھے، وہ فرماتے ہیں:

> ''اس فہرست سے اندازا ہوتا ہے کہ قدیم عربی شعرا کے اشعار منتخب کرنا اوران کے شعروں کے متعلق بحث وتمحیص، نقد و جرح میں خالدیین کی خاص دل چسپی ہے''۔

خالدیین کی تصنیف الاشباہ والنظائر میں بھی استطراداً بعض شعرا کے اشعار تفصیل سے درج ہیں، ابن الدمینہ ان کے محبوب شعرا میں تھا جن کے اشعار کا بہت اہم اورطویل انتخاب درج کیا ہے جو کتاب کے مختلف مقامات میں پھیلا ہوا ہے، مختارالدین صاحب نے انہیں ان کی کتاب سے یک جا کردیا ہے اور ابن الدمینہ کے قتل کے واقعات آخر میں درج کیا ہے، ان کی یہ کتاب خالدیین کے منتخب کردہ اشعار کا مجموعہ ہے جوان کے مفید عالمانہ حواشی وتعلیقات سے آراستہ ہے، سطور ذیل میں ان کے مختلف پہلوؤں پر بحث وگفتگو کی جائے گی۔

حواشی و تعلیقات

اختلاف نسخ: اختلاف نسخ کی تصریح کم وبیش ہر صفحے پر ہے لیکن اختلاف کی کئی نوعیتیں ہیں:

۱- محقق کے پیش نظر ابن الدمینہ کے دو دیوان تھے جن کی کیفیت پہلے بیان ہوچکی ہے ، اگر خالدیین کے انتخاب میں دونوں یا ایک سے فرق و اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کو واضح کرتے ہوئے ان کے صفحات کے حوالے دیے گئے ہیں۔

۲- ابن الدمینہ کے اشعار وحالات کے مصادر کا ذکر فاضل مرتب نے شروع ہی میں کیا ہے، اگر ان سے یا کسی سے خالدیین کے روایت کردہ اشعار مختلف ہیں تو اس کی صراحت کتاب، جلد اور صفحے کے حوالے سے کی ہے، اس میں ان کو کس قدر کدو کاوش کرنی پڑی ہے، اس کا اندازا تصحیح کے دوران مراجعت کی جانے والی کتابوں کی فہرست سے ہوتا ہے جو اس کتاب کے آخر میں دی گئی ہے۔

۳- بعض جگہ اختلاف کسی شعر کے ایک ہی لفظ میں ہے، بعض جگہ کئی کئی لفظوں میں اور

کہیں کہیں تو پورے مصرعہ ہی میں ہے، سب کی وضاحت کی گئی ہے۔

۴-کہیں اختلاف کسی ایک کتاب سے ہے اور کہیں دو تین یا کئی کتابوں اور مآخذ سے ہے، ان سب کی حواشی میں وضاحت وصراحت موجود ہے۔

۵-ابن الدمینہ کا جو شعر خالدیین نے نقل کیا ہے، وہ کس ماخذ کے مطابق ہے اور کس ماخذ سے مختلف، اس کی وضاحت مختلف مواقع پر کی گئی ہے، کہیں تو دو ایک لفظ کے بارے میں وضاحت ہے مثلاً صفحہ ایک پر یہ شعر:

عدمتک من نفس فانت سقیتنی کؤس الھوی من حب من لم یبالک

حاشیے میں دوسرے مصرعہ میں "من حب" کو الحماسة البصریه کی روایت کے موافق بتایا ہے لیکن دیوان میں "فی حب" کی روایت ہے۔(ص۱، حاشیہ نمبر ۵)

اور کہیں پورے مصرعہ کے بارے میں اس طرح کی وضاحت ہے مثلاً الی اللّٰہ اشکو ثم اثنی فاشتکی۔

اس کے متعلق مرتب نے لکھا ہے کہ ابو علی قالی کی روایت کے مطابق ہے اور دیوان اور حماسہ بصریہ کی روایت اس طرح ہے فان لی الماء الذی یردانه (ص ۳، حاشیہ نمبر ۴)

ایک اور مصرعہ ہے الی الله اشکو ثم اشکو الیکما، اس کے متعلق کہا ہے کہ یہ البیان والتبیین کی روایت کے موافق ہے مگر دیوان کی روایت یہ ہے خلیلی أنی الیوم شاک الیکما۔(ص ۲، حاشیہ نمبر ۷۹)

ایک اور مصرعہ ہے تضنین حتی یذھب البخل بالمنی، محقق نے لکھا ہے کہ دیوان میں روایت اس طرح ہے، تلجین حتی یزری الھجر بالھوی۔(ص ۵، حاشیہ نمبر ۲)

اشعار کی نسبتوں میں فرق واختلاف: بعض اشعار کو خالدیین نے ابن الدمینہ کے حوالے سے نقل کیا ہے مگر حاشیے میں دوسرے مآخذ سے انہیں کسی اور کا شعر بتایا ہے، مثلاً صفحہ ایک کی غزل کے متعلق لکھا ہے کہ:

پہلا، چھٹا اور ساتواں شعر زہرہ (ص ۴۱) میں خلیفہ بن روح الاسدی کے حوالے سے درج ہیں (ص ۱، حاشیہ نمبر ۴)۔

بعض مواقع پر ایک ہی شعر کو مختلف مآخذ میں مختلف اشخاص کی طرف منسوب کیا گیا ہے جیسے خالدیین نے ابن الدمینہ کا یہ شعر نقل کیا ہے:

لئن ساء نی ذکراک لی بمسائة لقد سرنی انی خطرت ببالک

محشی فرماتے ہیں کہ امالی قالی (۱/ ۳۰) میں اس شعر کو مرّہ کا بتایا ہے اور العقد الفرید جلد ۲۱/ ۵ میں علیہ بنت مہدی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ (ص ۲، حاشیہ نمبر ۴)

اسی طرح یہ دو شعر دیکھیے:

یحن فؤادی من مخافة بینکم حنین المزجی وجهة لا یریدها

ولن یبعث الواشون ان یصدعوا العصا اذا لم یکن صلبا علی البری عودها

محشی لکھتے ہیں دیوان میں یہ دونوں شعر نہیں ملتے مگر البیان والتبیین (۱/ ۲۸۱) نام کی تعیین کے بغیر قبیلہ بنی یربوع کے کسی شخص کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور ہمارے نسخہ بصریہ (۳۳۰) میں دونوں کو نخیس بن منیع کا بتایا ہے۔ (ص ۳، حاشیہ نمبر ۱)

ابن الدمینہ کے حوالے سے متن میں یہ شعر درج ہے:

فکونی علی الواشین لداء شغبة کما انا للواشی الد شغوب

محشی کا بیان ملاحظہ ہو:

اس شعر کو اصفہانی نے الاغانی (۸/ ۱۶۳) میں اور ابن خلکان نے وفیات الاعیان (۵/ ۴۱۱) میں نقل کیا ہے اور اسے ابن طثریہ کا بتایا ہے، فوات الوفیات (۲/ ۲۸) میں یزید بن الدثنہ کا بتایا گیا ہے مگر محقق کے خیال میں شاید یہ ابن الدمینہ کی تحریف ہے۔ (ص ۴، حاشیہ نمبر ۹)

اسی قافیے کے شعر ۶ اور ۱۰ تا ۱۴ اور پھر ۲۴ تا ۲۶ اشعار کے بارے میں فاضل مرتب کا کہنا ہے کہ وہ مجنوں عامری کی طرف منسوب ہیں اور اس کے دیوان میں موجود بھی ہیں۔ (ص ۴، حاشیہ نمبر ۱۰)

حاشیہ نگار نے ص ۵ کے پہلے دونوں شعروں کے متعلق ابو العباس ثعلب کا قول نقل کیا ہے وہ قیس بن ملوح مجنون بنی عامر کے ہیں، اصمعی نے اس سے لاعلمی ظاہر کی ہے مگر ابو الفرج الوشا نے

موشی (ص ۵۸) میں انہیں قیس عامری ہی کے بتائے ہیں، آمدی نے المؤتلف و المختلف (ص ۶۷) میں دعبل بن علی خزاعی کا لکھا ہے، ابن طیفور کی کتاب شعرائے بغداد اور مبارک بن احمد کی مختصر طبقات ابن المعتز (ص ۴۵۰) میں غصین بن براق ابو ہلال الاحدب سے منسوب ہیں اور آمدی کا بیان ہے کہ یہ دونوں ابن الدمینہ کے طویل قصیدے میں ہیں۔ (ص ۵، حاشیہ نمبر ۱)

اسی صفحے کا تیسرا شعر اغانی (۱۳/ ۳۷) میں عجیر سلولی سے منسوب ہے مگر بکری کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ یہ مالک بن صمصامہ جعدی کا شعر ہے۔ (ص ۵، حاشیہ نمبر ۳)

الاغانی (۱۹/ ۸۲) نے اسی قصیدے کے ۱۰ تا ۱۳ اشعار کو بھی مالک بن صمصامہ جعدی سے منسوب کیا ہے، (ص ۵، حاشیہ نمبر ۶) صفحہ ۶ پر اسی طویل قصیدے کے پندرہویں شعر کے متعلق حاشیے میں مرتب نے لکھا ہے کہ عیون الاخبار (۴/ ۱۴۱) میں ابن میادہ سے اور کتاب الزہرہ (ص ۷۷) اور المجتبیٰ ابن درید (ص ۸۴) میں صخر بن جعد محاربی سے کیا گیا ہے، (ص ۶، حاشیہ نمبر ۱)، ص ۷ پر اسی قصیدے کے تیسرے شعر کے متعلق مرتب نے یہ نوٹ تحریر کیا ہے:

> "سمط اللالی (۶۷۶) میں اس کو بنو عبس کے کسی شخص کا بتایا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ بنی فقعص کے ایک شخص کا ہے جس کا نام مرار بن سعید فقعسی تھا، انباری کی کتاب الاضداد (ص ۱۰۲) میں ابو العباس ثعلب کی روایت ہے، اس کو ابن الدمینہ سے منسوب کیا ہے، المجتبیٰ (ص ۸۴) میں یہ شعر اقرع بن معاذ قشیری سے منسوب کیا گیا ہے، جب کہ معجم البلدان (۳/ ۱۸) اور کتاب الزہرہ (۲۴۳) میں ورد بن ورد جعدی سے منسوب ہے"۔ (ص ۷، حاشیہ نمبر ۳)

۷- خالدیین کی کتاب کا نام الاشباہ والنظائر ہے، اس کے اقتضا سے ابن الدمینہ کے اشعار کے ہم معنی دوسرے شعرا کے اشعار بھی وہ نقل کرتے گئے ہیں اور جا بجا ان پر اس طرح کا اظہار خیال اور مختصر تبصرہ بھی کیا ہے کہ اس مضمون میں کن کن شعرا نے اشعار کہے ہیں اور کس شاعر نے سب سے پہلے طبع آزمائی کی ہے اور کس کا شعر زیادہ اچھا اور بہتر ہے، یا یہ کہا ہے کہ یہ مضمون ابن الدمینہ کی اختراع ہے جس پر بعد کے شعرا نے طبع آزمائی کی ہے یا یہ بتایا ہے کہ یہ مضمون

متقدمین و محدثین شعرا کے یہاں بہ کثرت استعمال ہوا ہے، ایسے موقعوں پر خالدیین نے مشابہ و مماثل جو اشعار نقل کیے ہیں اور ان کو کسی شاعر کی طرف منسوب کیا ہے، اگر فاضل محقق کو اس طرح کے اشعار کے متعلق دوسرے مراجع و مصادر سے معلوم ہوا کہ وہ شعر ان کے بجائے کسی اور کا ہے یا کسی اور مصدر میں دوسرے شاعر سے منسوب ہے تو انہوں نے حواشی میں اس کا تذکرہ کردیا ہے، مثلاً ص ۷ پر خالدیین نے مجنون عامری کے حوالے سے دو شعر نقل کیے ہیں، اس پر فاضل محقق کی ایرادات ملاحظہ ہوں:

"نویری (ج ۲، ص ۶۱) بغدادی کی خزانہ اور الاغانی (۲/ ۳۲) اور مختار شعر بشار میں دونوں شعر اور دیوان المعانی (۱/ ۲۴۱) میں صرف دوسرا شعر ہی مجنون سے منسوب ہے مگر معاہد التنصیص (۲/ ۱۲) میں نُصیب سے منسوب ہیں، نویری (۲/ ۶۳) میں ابن میادہ سے منسوب ہیں، ابن ابی عون کی تشبیہات (ص ۱۰۷) اور ابو ہلال عسکری کی کتاب الصناعتین (ص ۲۰۰) میں کسی سے منسوب کیے بغیر ہی مذکور ہیں"۔ (ص ۸، حاشیہ نمبر ۳)

یہ شعر اسی صفحے پر اس کے بعد کا شعر خالدیین نے شاعر کا نام لیے بغیر ہی نقل کیا ہے، کتاب کے فاضل محقق لکھتے ہیں:

"نویری (۲/ ۶۹) کے بہ موجب یہ شعر شقیق بن سلیک کا ہے اور دیوان المعانی (۲/ ۲۴۱)، التشبیہات (ص ۱۰۷)، معاہد التنصیص (۲/ ۲۰) اور الصناعتین کے بہ موجب یہ سُلیک کا شعر ہے"۔ (ص ۸، حاشیہ نمبر ۴)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں مصادر کا جو فرق ہے اسے اسی صفحے کے پانچویں حاشیے میں ظاہر کیا ہے لیکن بعض مقامات پر اس طرح کے اشعار کے قائلین کی تعیین خالدیین نے نہیں کی ہے اور فاضل مرتب بھی قائل کی تعیین اور شاعر کے نام کی تصریح نہیں کرسکے ہیں جیسے صفحہ ۳ پر خالدیین نے فقد اخذہ بعضھم فقال کہہ کر اور صفحہ ۱۰ پر واخذہ بعض الکتاب کہہ کر جو شعر نقل کیے ہیں، ان میں بعض کی تعیین محقق نہیں کرسکے، اسی طرح صفحہ ۱۵ پر دو جگہ وقال آخر اور ایک جگہ مثلہ کہہ کر تین شعر خالدیین نے درج کیے ہیں مگر شاعر کے نام کی تعیین نہ خالدیین کرسکے ہیں اور نہ موجودہ مصادر میں فاضل محقق کو معلوم ہوسکا ہے۔

مآخذ و مصادر کی نشان دہی: خالدیین نے اشعار کے قائلین کے نام عموماً لکھے ہیں مگر اکثر مآخذ و مصادر کی تعیین مصنف نہیں کر سکے ہیں اور حوالے بھی نہیں دیے ہیں، فاضل محقق نے حاشیے میں تلاش و جستجو کے بعد ان کے مصادر کے نام اور حوالے درج کر دیے ہیں، مثلاً صفحہ ۹ پر بشار کا ایک شعر نقل ہوا ہے، حاشیے میں فاضل محقق نے تصریح کی کہ یہ شعر الحماسۃ البصریہ ص ۳۲۴، امالی القالی (۱/ ۲۲۳)، الحصری (۱/ ۲۰۶)، الاغانی (۱۳/ ۱۲۱)، التشبیہات (ص ۱۰۷)، النویری (۲/ ۶۳)، دیوان المعانی (۱/ ۲۴۱)، معاہد التنصیص (۲/ ۱۲۰)، الموشی (ص ۱۴۳)، دیوان بشار (ص ۲۴۷) میں موجود ہے۔ (ص ۹، حاشیہ نمبر ۱)

اسی طرح بحتری کا ایک شعر خالدیین نے دیا ہے، مرتب و محقق نے مطبع جوائب کے چھپے ہوئے اس کے دیوان (۱/ ۲۲۰) کا حوالہ دیا ہے۔ (ص ۹، حاشیہ نمبر ۴)

ذوالرمہ کا ایک شعر آیا تو محشی نے اس کے لیے اس کے دیوان ص ۹ کا حوالہ دیا (ص ۱۲، حاشیہ نمبر ۱)، محقق کو اس طرح کے بعض مواقع پر جن شعروں کے حوالے نہیں مل سکے ہیں، دیانت داری کے تقاضے کے بموجب ان کا تذکرہ حاشیہ میں کر دیا ہے، مثلاً ایک جگہ خالدیین نے ابن المعتز کے حوالے سے ایک شعر نقل کیا ہے، اس کے لیے محقق نے لکھا ہے کہ ہمیں ابن المعتز کے دیوان میں یہ شعر نہیں ملا۔ (ص ۹، حاشیہ نمبر ۶)

ابوتمام کے دو شعر خالدیین نے درج کیے ہیں جس کے پہلے شعر کے لیے مرتب نے حسب ذیل حوالے دیے ہیں، ابن ابی عون کی التشبیہات ص ۱۰۸، حصری (۱/ ۲۰)، دیوان المعانی (۱/ ۲۴۱)، سمط اللآلی (ص ۵۲۲)، مختار شعر بشار (ص ۳۹) مگر یہ بھی لکھا ہے کہ ابوتمام کے دیوان میں شعر درج نہیں ہے (ص ۹ حاشیہ ۷) اور دوسرے شعر کے تحت لکھتے ہیں، دونوں شعر دیوان المعانی (۱/ ۲۴۱)، شرح المقامات الحریریہ للشریشی (۱/ ۱۲۰) میں مذکور ہیں مگر جوسنہ کی بات ہے کہ دیوان ابوتمام محققہ محمد عبدہ عزام (قاہرہ ۱۹۵۱ء) میں یہ اشعار موجود نہیں۔ (ص ۹، حاشیہ ۸)

اسی طرح بشار کے ایک شعر کے متعلق فاضل محقق نے لکھا ہے کہ وہ ہمیں اس کے مطبوعہ دیوان میں نہیں مل سکا جسے استاذ محمد الطاہر ابن عاشور نے شائع کیا ہے (ص ۱۰، حاشیہ ۱)، خالدیین میں ابن الدمینہ کی نسبت سے جو اشعار نقل کیے ہیں ان میں جو محقق کو نہیں ملے ان پر

ستارے کا نشان بنادیا ہے اور اگر وہ دوسرے مصادر میں ابن الدمینہ کے بجائے کسی اور کے نام سے درج ہیں تو اس کو بھی واضح کردیا ہے کہ وہ کن کتابوں میں کس شاعر سے منسوب ہیں، ان سب کی مثالیں ہم پہلے نقل کرچکے ہیں مگر خالدیین نے ابن الدمینہ کے بعض ایسے اشعار بھی نقل کیے ہیں جو نہ اس کے دیوان میں ملے اور نہ کسی اور ماخذ میں تو فاضل محقق نے اس پر نوٹ لکھ کر بتادیا ہے کہ مجھے یہ شعر نہیں مل سکا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھا ہے کہ ''شعر نہ اس کے دیوان میں ہے اور نہ کسی دوسری جگہ ہم کو ملا''۔ (ص ۴، حاشیہ ۲)

ایک جگہ چار شعروں کے بارے میں یہ نوٹ دیا ہے کہ پہلے اور چوتھے شعر کی تخریج یاقوت حموی نے معجم البلدان (۳؍ ۲۲۳) میں کی ہے اور انہیں بعض قرشیین کا بتایا ہے مگر دوسرا اور تیسرا شعر ہمیں کسی مصدر میں نہیں ملا۔ (ص ۱۴، حاشیہ ۹)

اشعار کا پس منظر اور خطاب کی تعیین: حاشیے میں بعض اشعار کا پس منظر بیان کیا ہے کہ وہ کس تقریب سے کہے گئے ہیں اور ان میں کس سے خطاب ہے مثلاً بحتری کے ایک شعر کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ابو الخطاب کی مدح میں ہے (ص ۹، حاشیہ ۴)، ایک جگہ ابوالحسن نوبختی کے دو شعر متن میں درج ہیں، ان کے متعلق حاشیے میں بتایا کہ ''ان میں مروان بن محمد کی مدح کی ہے''، پھر اس کے واقعے اور شعروں کے دوسرے ماخذ بتائے ہیں (ص ۲۷، حاشیہ ۲)؛ بحتری کے ایک اور شعر پر یہ نوٹ ہے ''یہ متوکل کے وزیر فتح بن خاقان کی مدح میں ہے''۔ (ص ۲۷، حاشیہ ۳)

الفاظ کے معانی: فاضل محقق نے حاشیے میں بعض مشکل لفظوں کے معنی لکھ دیے ہیں جیسے متن میں ابن الدمینہ کے پہلے شعر کے پہلے مصرع کے آخر میں نقرء تحية آیا ہے، محشی نے اس پر حاشیہ تحریر کیا ہے کہ ''دیوان میں اس کے بجائے نقض لبانة کی روایت ملتی ہے اور لَبَانَةٌ کے معنی حاجت کے ہیں۔ (ص ۱، حاشیہ ۲)

ایک شعر کا پہلا مصرعہ متن میں یہ نقل ہوا ہے لطیف الحشا، عبل الشوی، طيب اللمى، اس پر یہ حاشیہ ہے کہ دیوان کی روایت میں طیب اللمی کی جگہ طيب النثا ہے اور النثا ذکر قبیح وحسن دونوں معنوں میں آتا ہے اور لمی سمرة الشفتين (ہونٹوں کے گیہواں رنگ) کو کہتے ہیں (ص ۴، حاشیہ نمبر ۱)، ایک اور حاشیے میں ''دوسر'' کے معنی البعير

الشدید لکھے ہیں۔(ص ۱۱، حاشیہ ۳)

ایک شعر میں قرقضیہ کا لفظ آیا ہے، اس کے معنی حاشیے میں شراب لکھا ہے (ص ۱۳، حاشیہ ۲)، ایک شعر میں شقة رجفان آیا ہے، مرتب نے بتایا ہے کہ دیوان میں نعسبة حدثان کی روایت ہے اور الحدث نوجوان کو کہتے ہیں۔(ص ۱۶، حاشیہ ۳)

بعض جگہ محقق نے الفاظ کے اعراب وحرکات کی صراحت کی ہے، جیسے الحدث کے بارے میں لکھا ہے یہ بالتحریک ہے یعنی دال پر جزم وتشدید نہیں ہے۔(ص ۱۶، حاشیہ ۳)

ایک جگہ مصیصی کے متعلق لکھا ہے کہ میم پر فتحہ ہے پھر ص پر زیر اور تشدید ہے، ازہری وغیرہ اہل لغت نے اسے اسی طرح ضبط کیا ہے اور پہلے صاد کو مشدد بتایا ہے لیکن جوہری کی تنہا رائے ہے کہ دونوں ص مخفف ہیں لیکن پہلا قول صحیح ہے، ابن خلکان نے میم کو مکسور کہا ہے (وفیات ۱۰۹/۱) ومعجم البلدان (۱۴۴/۵)۔(ص ۴۱، حاشیہ ۴)

بعض جگہ کسی لفظ کے معنی کی تعیین نہیں ہوسکی تو اس کو بھی بیان کیا ہے مثلاً ایک شعر میں فُضّ حصینها آیا ہے، حاشیے میں ہے کہ دیوان میں حطینها کی روایت ہے لیکن دونوں لفظوں کے معنی سے مجھے واقفیت نہیں ہوسکی، ہوسکتا ہے یہ عن مطیتها کی تصحیف ہو جیسا کہ نفاخ نے کہا ہے۔(ص ۳۵، حاشیہ ۳)

اسی طرح جگہوں، کنوؤں، چشموں اور پہاڑوں وغیرہ کے نام آئے ہیں تو محقق نے، ان کی وضاحت کردی ہے، مثلاً ایک شعر میں علیا کا لفظ آیا ہے، اس کے بجائے دیوان میں حجلا مذکور ہے، جو یمامہ میں ایک کنواں ہے (معجم البلدان، ۲۲۵/۲) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قبیلہ خثعم کا چشمہ تھا۔(ص ۱۲، حاشیہ ۸)

ایک اور لفظ نیق کے معنی پہاڑ بتایا ہے (ص ۱۲، حاشیہ ۹)، ایک جگہ متن میں صمد کا لفظ آیا ہے، حاشیے میں اسے ضباب کا چشمہ بتایا گیا ہے (ص ۱۴ و ۱۵، حاشیہ ۱۰)

ایک شعر میں قرعا کا لفظ ہے جو معجم البلدان کتاب الزہرہ اور ابوعلی قالی کی روایت میں روحا ہے، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"مدینہ سے مکہ آتے ہوئے دوشب کی مسافت پر روحا ایک گاؤں

ہے اور قرعا مکہ کے راستے میں کوفہ سے آتے ہوئے مغیثہ کے بعد جب مکہ کا رخ کیا جاتا ہے تو ایک منزل ہے"۔ (ص ۱۶، حاشیہ ۵)

خیف کے متعلق لکھتے ہیں حجاز میں ایک مقام کا نام ہے (ص ۲۷، حاشیہ ۱)، ایک شعر میں ایک لفظ دون الاراک ہے، محقق نے بتایا ہے کہ دیوان میں بالعابدین ہے جو ایک وادی ہے، بکری نے معجم ما استعجم میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (ص ۳۱، حاشیہ ۳)

نبالہ کے متعلق لکھا ہے کہ بلاد یمن میں ایک جگہ کا نام ہے، اس کے اور مکہ کے درمیان ۵۲ فرسنگ کا فاصلہ ہے یعنی تقریباً آٹھ روز کی مسافت۔ (ص ۵۲، حاشیہ ۷)

ترجمے: متن میں بعض جگہ خالدیین نے کسی شاعر کا نام لے کر یا نام لیے بغیر اس کا کوئی شعر نقل کیا ہے تو محقق نے اس شاعر کا ترجمہ لکھا ہے اور مراجع کی تعیین بھی کی ہے، اگر شاعر نے نام کے سلسلے میں کوئی غلطی کی ہے تو اس کی تصحیح کر دی ہے، مثلاً خالدیین نے ایک جگہ عمارہ بن عقیل کے دو شعر نقل کیے ہیں، محشی عمارہ کے متعلق یہ نوٹ لکھتے ہیں:

"یہ عمارہ بن بلال بن جریر بن عطیہ بن الخطفی ہے، اس کی کنیت ابوعقیل تھی، متقدم شاعر ہے، گاؤں سے شہر میں آیا تو اس کے شعروں سے لوگوں کو واقفیت ہوئی، وہ اپنے زمانے کا بڑا شاعر تھا، خلفا و وزرا اور رؤسا و ملوک کی شان میں قصائد کہہ کر بڑی دولت کمائی، پھر گاؤں واپس چلا آیا، ابن المعتز کے طبقات الشعرا (ص ۳۱۶)، مرزبانی کی معجم الشعرا (ص ۷۸)، الاغانی (۲۰/ ۱۸۳) اور بغدادی کی خزانہ (۲/ ۴۵۷) میں اس کا ترجمہ دیا ہے"۔ (ص ۳، حاشیہ ۲)

حماد عجرد کے متعلق نوٹ قلم بند کیا ہے:

"یہ عباسی عہد کا مشہور شاعر ہے، پہلے معلمی کرتا تھا پھر اس نے شعر گوئی میں شہرت حاصل کی اور بادشاہوں کی مدح کی، ۱۶۱ھ میں وفات پائی، ترجمے کے لیے طبقات الشعرا ابن معتز ص ۶۷، وفیات ابن خلکان ص ۳۴۲، الشعر والشعرا ابن قتیبہ ص ۴۹۰ اور کتاب الاوراق صولی

(۳/۸-۱۰) دیکھیے۔(ص ۱۰،حاشیہ ۲)

ایک جگہ خالدیین نے ابی قنن کا شعر نقل کیا ہے، فاضل مرتب لکھتے ہیں:

"احمد بن ابی قنن ، ربیع بن یونس کا غلام اور سیاہ فام تھا، بغداد کے شعرا میں اچھا شاعر تھا، طبقات الشعرا ابن المعتز (ص ۳۹۶)، فوات الوفیات ابن شاکر کتبی (۱/ ۸۳) اور تاریخ بغداد خطیب بغدادی (ص ۱۷۳) میں اس کا تذکرہ ہے۔(ص ۲۰،حاشیہ ۴)

نمیری شاعر کے متعلق محشی کا نوٹ ہے" اس کا نام محمد بن عبداللہ بن نمیر ثقفی یا نمیری تھا، اس کو حجاج کی بہن زینب بنت یوسف سے عشق تھا، اس کا یہ شعر دوسرے اشعار کے ساتھ ہمارے نسخہ حماسة البصریه (ص ۳۲۰)، الاغانی (۶/ ۱۹۲)، الکامل مبرد (ص ۲۸۹، ۳۹۷، ۵۳۷)، اشعار النسا مرزبانی (ص ۱۰)، امالی قالی (ص ۲۶)، المحاسن والاضداد (ص ۲۳۷)، زهر الآداب حصری (۱/ ۱۵۷)، العقد الفرید (۳/ ۱۴۵)، اضداد انباری (ص ۲۸۹)، مقاییس اللغة ابن فارس (۳/ ۱۷/ ۳) اور خود خالدیین کی الاشباہ و النظائر میں موجود ہے۔(ص ۲۶، حاشیہ ۶)

ہشام بن عبدالملک کے مولی اعمیٰ کا شعر متن میں آیا تو اس پر حاشیے میں فاضل مرتب نے لکھا:

"اس کا نام ابوالعباس سائب اور باپ کا فروخ ہے جو بنو بکر بن عبد منات کے مولی تھے اور منات بنی عبد شمس میں تھے، وہ بنی امیہ کے گنے چنے شعرا میں تھے اور ان کی مدح وحمایت میں پیش پیش رہتے تھے، ۱۲۶ھ کے بعد وفات پائی، الاغانی (۱۵/ ۵۷)، فوات الوفیات (۱/ ۱۳۳) میں اس کا ترجمہ دیا ہے۔(ص ۲۶، حاشیہ ۸)

الضوبری شاعر کے متعلق پروفیسر مختار الدین احمد رقم طراز ہیں:

"اس کا نام احمد بن محمد بن الحسن ابوبکر الضبی ہے جو ضوبری اور حلبی کی نسبتوں سے مشہور ہے، ۳۳۴ھ میں وفات پائی، بڑا نغز گو شاعر تھا، باغ و چمن کا

شیدائی، گانے اور مذاق کا دل دادہ اور سیف الدولہ کے دربار کے حاضر باشوں میں تھا، ملاحظہ ہو فوات الوفیات (۱/ ۷۷) و تاریخ دمشق ابن عساکر (۱/ ۴۵۶)۔ (ص ۲۸، حاشیہ ۲)

اسی طرح نوبختی اور بعیث پر بھی مختارالدین صاحب نے نوٹ لکھے ہیں ملاحظہ ہو ص ۲۸، حاشیہ ۵ و ص ۲۹، حاشیہ ۲۔

خالدیین کے متن کی نثری عبارتوں میں آنے والے ناموں پر بھی مختصر، جامع اور محققانہ نوٹ درج ہیں، مثلاً ابوبکر محمد بن یحییٰ الصولی پر یہ معلومات افزا حاشیہ ہے:

''ابوبکر محمد بن یحییٰ بن عباس بن صول مشہور انشا پرداز ہے جو الصولی، الشطرنجی کی نسبت سے مشہور اور کتاب الاوراق اور ادب الکاتب کا مصنف ہے، بلند پایہ شاعر بھی تھا، ثعلب، مبرد اور بجستانی وغیرہ سے روایت کرتا ہے اور اس سے دار قطنی اور مرزبانی وغیرہ نے روایت کی ہے، خلیفہ راضی کا ندیم تھا، شروع میں اس کو تعلیم دینے پر مامور ہوا تھا، اس کے بعد مقتدر کے ندما میں ہو گیا تھا، کتاب الوزرا، کتاب الورقہ، ادب الکاتب اور اخبار ابی تمام اس کی مشہور تصنیفات ہیں، ۳۲۵ھ میں وفات ہوئی، ملاحظہ ہو وفیات الاعیان (۳/ ۴۷۷)''۔ (ص ۲۲، حاشیہ ۱)

ابوالعینا پر نوٹ ہے:

''ابوعبداللہ محمد بن القاسم بن خلاد یمامی ابوالعینا کے نام سے مشہور ہے، بنی ہاشم کا مولی تھا، برجستہ گوئی، حاضر جوابی اور ذہانت میں بے مثال تھا، متوکل کے ساتھ اس کے متعدد واقعات و اخبار مشہور ہیں، بصرہ میں ۲۸۲ھ میں وفات ہوئی''۔ (دیکھیے معجم الشعرا مرزبانی ص ۴۴۸، زھر الآداب حصری جلد ۱، ص ۳۲۳، طبقات الشعرا ابن المعتز ص ۱۹۶، وفیات ۳/ ۲۶۳) (ص ۲۲، حاشیہ ۲)

ابوالمھنا مخارق المغنی کے متعلق لکھتے ہیں: ''یہ مخارق بن یحییٰ بن ناوس الجزار ہے، جو

رشید کا مولی و مغنی تھا، کنیت ابوالمھنا تھی، اپنے زمانے میں غنا کے فن کا ماہر اور بڑا خوش الحان تھا، خلیفہ ہارون الرشید اسے بہت پسند کرتے تھے، ایک بار اسے اپنے برابر تخت پر بٹھایا اور تیس ہزار درہم انعام دیا، بعد میں مامون سے متوسل ہوا اور اس کے ساتھ دمشق کا سفر کیا، سرمن رائی میں ۲۳۱ھ میں فوت ہوا، اس کے واقعات بے شمار ہیں، وہ دراصل کوفہ میں عاتکہ بنت شھدہ کا غلام تھا، اسی نے اس کو غنا و موسیقی کی تعلیم دلائی تھی اور فروخت کر دیا تھا، پھر وہ ہارون رشید سے وابستہ ہوا جس کا تذکرہ ابراہیم موصلی نے خلیفہ سے کیا تھا، جب اس نے اسے سنا تو آزاد کر دیا اور انعام واکرام سے نوازا، ملاحظہ ہو اعلام (۶۸/۸)، النجوم الزاھرہ (۲۶۰/۲)، طبری (۲۱/۱۱)، الاغانی (۷۱/۳)۔ (ص ۲۲، حاشیہ ۳)

سلیمان بن وہب پر یہ حاشیہ تحریر کیا ہے:

> "ابو ایوب سلیمان بن وہب بن سعید بن عمرو حارثی، وزیر اور شام و عراق میں کتابت و انشا کے دفتر سے وابستہ ایک بڑا کاتب تھا، بغداد میں پیدا ہوا، چودہ برس کی عمر میں مامون کا منشی ہوا، مہتدی باللہ اور معتضد علی اللہ کا وزیر ہوا، مگر موفق باللہ کے زمانے میں معتوب ہوا اور قید کر لیا گیا، قید خانے ہی میں ۲۷۲ھ میں وفات پائی، اپنے زمانے میں علم و ادب اور عقل و فرزانگی میں بے مثال تھا، اس کی اس کے بھائی حسن بن وہب کی مدح میں ابوتمام، بحتری اور اس طبقے کے دوسرے شعرا نے قصیدے کہے ہیں، اس کے حالات الاعلام (۲۰۱/۲)، وفیات الاعیان (۱۴۴/۲)، الاغانی (۲/۶۷-۷۳) اور سمط اللآلی (ص ۵۰۲) میں مذکور ہیں۔ (ص ۲۳، حاشیہ ۲)

اسی طرح خلیفہ متوکل اور اخبار ابن المدینہ کے مصنف زبیر بن بکار پر بھی سوانحی حاشیے درج ہیں۔

مختصر واقعات کی تفصیل: خالدیین کی نثری عبارتوں میں کسی جگہ کوئی واقعہ یا حکایت درج ہے، حاشیے میں اس کی تفصیل جاننے کے لیے یا تو بعض مصادر کی نشان دہی کی گئی ہے یا پورا واقعہ ہی بیان کیا گیا ہے اور بعض جگہ متن میں نقل واقعہ میں اگر غلطی ہوگئی ہے تو حاشیے میں اس کی

اصلاح وتصحیح کردی گئی ہے، ہر ایک کی مثالیں پیش کی جاتی ہے۔

ایک جگہ مشہور مرثیہ گو شاعر متمم بن نویرہ سے حضرت عمرؓ کے یہ دریافت کرنے کا تذکرہ ہے کہ وہ اپنے بھائی مالک کے قتل پر اتنا زیادہ مغموم ومحزون کیوں ہے، اس پر فاضل محشی نے یہ تین نوٹ قلم بند کیے ہیں:

۱- یہ پورا قصہ الاغانی محققہ استاذ عبدالستار احمد فراج (۱۵/ ۲۳۹-۲۴۹) میں مذکور ہے۔ (ص ۱۸، حاشیہ ۷)

۲- مالک بن نویرہ کے واقعہ قتل کے لیے دیکھیے خزانة الادب (۱/ ۲۳۶)، محققہ الاستاذ عبدالعزیز المیمنی و تاریخ دمشق ابن عساکر (۵/ ۱۰۵)، الاغانی (۱۴/ ۶۴) اور فوات شاکر کتبی (۲/ ۶۲۶)۔ (ص ۱۸، حاشیہ ۸)

۳- ابن شاکر کتبی لکھتے ہیں کہ متمم سے پوچھا گیا کہ تم کو اپنے بھائی کا اتنا شدید غم وملال کیوں ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "میری ایک آنکھ میں زخم ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے بیس برس سے اس آنکھ سے ایک قطرہ بھی آنسو نہیں ٹپکا تھا لیکن میرا بھائی مارا گیا تو اس کی روانی اتنی تیز ہوگئی ہے کہ آنسو رکتے ہی نہیں"۔ (دیکھیے فوات الوفیات، ۲/ ۲۹۷) (ص ۱۸/ حاشیہ ۹)

بعض اشعار کے متعلق دل چسپ واقعات اور وضاحتیں: پہلے گزرا ہے کہ خالدیین کی ایک عادت یہ ہے کہ وہ ابن الدمینہ کا کوئی شعر نقل کرتے ہیں تو اس کے ہم معنی دوسرے شعرا کے اشعار بھی نقل کردیتے ہیں، چنانچہ ابن الدمینہ کے ایک مصرع میں اس تمنا کا اظہار ہے کہ کاش وہ اور اس کا محبوب کسی وحشی جانور کے دو فرد ہوتے تو ہمیشہ ایک ساتھ رہتے اور زندگی بسر کرتے، اسی طرح کا ایک شعر خالدیین نے فرزدق کا یہ نقل کیا ہے:

الا لیتنا کنا بعیرین لا نرد علی منهل الا نشل و نقذف

اس پر مختار الدین احمد صاحب نے یہ دل چسپ حاشیہ لکھا ہے کہ فرزدق کا یہ اور اس کے بعد کے دو شعر ابن الاثیر جزری نے اپنی کتاب المثل السائر کے باب التقریظ والافراط میں نقل کر کے لکھا ہے:

'اس شخص نے جس وقت یہ شعر کہے تھے اس وقت اس کی عقل زائل

ہوگئی تھی، اس کی یہ تمنا کس قدر پست درجہ کی ہے کہ وہ اور اس کا محبوب دو خارشتی اونٹوں کی طرح ہو جاتے کہ ان سے جو قریب آتا یا وہ جس کے قریب جاتے وہ انہیں مار کر بھگا دیتا، ظاہر ہے یہ بڑی حقیر اور نہایت پست آرزو ہے''۔(المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر ،۲/۳۱۷) (ص ۳۸،حاشیہ ۲)

ایک جگہ بشار کی ایک حکایت کا ذکر آ گیا تو محشی نے اس کے مصادر بتاتے ہوئے اس کی کسی قدر تفصیل بھی دی ہے، ملاحظہ ہو۔

اس واقعہ کی روایت صولی نے ادب الکاتب (ص ۴۴)، ابن خلکان نے وفیات الاعیان (۱/۲۰۲) میں صاعد لغوی کی کتاب الفصوص سے اور ابو عبید بکری نے اللآلی (ص ۱۹۷) میں کیا ہے، ابو عبید کے الفاظ یہ ہیں:

''ابن مرزبان نے اپنی کتاب اخبار الشعر میں بیان کیا ہے کہ ابو العتاہیہ بشار بن برد کی ملاقات کے لیے گیا تو بشار نے اس سے کہا بہ خدا رونے کے معاملے میں مجھے تمہارا یہ عذر بہت پسند آیا

کم من صدیق لی اسا رقہ البکاء من الحیاء

تو ابو العتاہیہ نے کہا اس میں اولیت کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے، میں نے آپ ہی کی خوشہ چینی کی ہے''۔(ص ۲۰، حاشیہ ۱)

متن میں ایک جگہ زبیر کا یہ قول نقل ہوا کہ ''ابن الدمینہ غزل ونغز گوئی کے باوجود شہ سوار اور بہادر تھا اور خثعم وسلول کے درمیان ہونے والی جنگ میں قتل ہوا تھا'' مختار الدین احمد صاحب یہ لکھ کر ہمارے علم میں اضافہ کرتے ہیں:

''یہ روایت زیادہ مکمل صورت میں الاغانی (۱۷/۴۹) میں مذکور ہے اور معاھد التنصیص (ص ۵۹) اور المغتالین من الشعرا ابن حبیب (ورق ۱۳۳) میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے''۔(ص ۵۰، حاشیہ ۱)

اجمال و ابہام کی شرح و وضاحت: کہیں کہیں خالدیین کی عبارت مجمل و مبہم ہے اس لیے فاضل محقق نے حاشیے میں اس کی شرح و وضاحت کر دی ہے مثلاً ایک جگہ متن میں صرف

العباس لکھا ہے، حاشیے میں ہے کہ ''یہ عباس الاحنف ہے''۔ (ص ۴۱، حاشیہ ۲)

اسی ضمن میں عباس المصیصی کا نام بھی آیا ہے، محشی لکھتے ہیں ''ہمارے نسخے میں یہ مصیفی تھا لیکن شاید یہ مصیصی ہے اور اس سے مراد عباس الخیاط المصیصی ہے جس کا تذکرہ کتاب التحف والھدایا میں ہے اور خالدیین نے اپنی کتاب (ص ۶۵) میں اس کا قطعہ درج کیا ہے اور مرزبانی نے الموشح (۳۲۴) میں اس کا تذکرہ ضمناً کیا ہے، شریشی کی مقامات حریری کی شرح (۲/۲۳۹) میں، ابن عبدربہ کی العقد الفرید (۶/۸۶) میں اور ابن ابی عون کاتب بغدادی کی کتاب التشبیھات صفحات ۳۱، ۲۹۵، ۳۱۰، ۳۴۶ اور ۳۵۲ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ (ص ۴۱، حاشیہ ۴)

خالدیین نے ایک شعر نقل کیا ہے اور کہنے والے کا نام لینے کے بجائے صرف قایل لکھا ہے، اس کی وضاحت حاشیے میں اس طرح کی ہے، ''یہ شعر یزید بن عثمان کا ہے جیسا کہ العقد الفرید (۶/۱۷۳) میں ہے۔ (ص ۴۴، حاشیہ ۱)

آگے قال آخر کہہ کر دو شعر متن میں درج ہیں، حاشیے میں آخر کی وضاحت اس طرح کی ہے، ''یہ دونوں شعر کے کہنے والے ذوالرمہ ہیں دیکھو ان کا دیوان ص ۶۶ اور مختار شعر بشار ص ۸۶''۔ (ص ۴۵، حاشیہ ۱)

اغلاط کی تصحیح اور تصحیف کی نشان دہی: بعض جگہ فاضل مرتب و محقق نے خالدیین کی کتاب الاشباہ والنظائر کے پیش نظر مخطوطہ قاہرہ کے ناسخ کے لکھے ہوئے بعض غلط الفاظ کی تصحیح کی ہے یا اس کی تصحیفات کو درست کر دیا ہے، جس کی صراحت انہوں نے حاشیے میں بھی کی ہے، مثلاً ایک جگہ متن میں لاتشرون درج تھا، انہوں نے البیان والتبیین اور سمط اللآلی سے تصحیح کر کے والا تشرفین کر دیا ہے۔ (ص ۱۵، حاشیہ ۲)

ابن الدمینہ کے ایک شعر کے ایک غلط لفظ کی تصحیح کر کے متن میں اسے قراح کر دیا ہے اور حاشیے میں لکھا ہے کہ اصل میں یہ اقاح تھا لیکن غالباً صحیح قراح ہے جیسا کہ میمنی کا بیان ہے۔ (ص ۳۱، حاشیہ ۷)

ایک اور شعر میں تصحیح کر کے اخا الجن کر دیا ہے اور حاشیے میں لکھا ہے نسخہ مغربیہ میں

یہ ''اخا الحق'' تھا، ہم نے نسخہ مشرقیہ، دیوان شائع کردہ نفاخ اور کتاب الزھرہ سے تصحیح کرکے اسے اخا الجن کردیا ہے۔ (ص ۳۳، حاشیہ ۳)

ایک جگہ تصحیح کردہ لفظ متن میں ضمانۃ لکھا ہے اور حاشیہ میں بتایا ہے کہ اصل میں صمایۃ ہے، تصحیح اس کے دیوان سے کی گئی ہے۔ (ص ۳۴، حاشیہ ٦)

''من غورین غوری'' کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ اصل میں ''من الغور غوری'' تھا جس کو دیوان سے صحیح کردیا گیا (ص ۳۵، حاشیہ ۲)؛ ''لا نوال تنیلہ'' متن میں کہا گیا ہے اور حاشیے میں وضاحت کی ہے کہ اصل میں لا توکل سلہ تھا، تصحیح الاشباہ والنظائر کے نسخہ مشرقیہ اور دیوان شائع کردہ نفاخ سے کی گئی ہے۔

ایک شعر میں ''خربت'' کی تصحیح کرکے بتایا ہے کہ اصل میں ''حرمت'' تھا (ص ۴۲، حاشیہ ۱)، ایک جگہ یہ پورا مصرع متن میں بریکٹ میں لکھا ہے (وربی اولی بالتجاوز والغفر) اور حاشیے میں لکھا ہے کہ یہاں اصل میں بیاض تھی مگر یہ نہیں بتایا کہ بیاض کو کس ماخذ سے پر کیا ہے۔ (ص ۴۲، حاشیہ ٦)

ایک اور شعر کے لفظ کو اصلاح کے بعد المخارم کیا ہے اور حاشیے میں بتایا ہے کہ الاشباہ والنظائر میں یہ محارم تھا، اس کی صحت دیوان سے کی گئی ہے، مخارم کی واحد مخرم ہے جس کے معنی طریق (راستہ) کے ہیں۔ (ص ۴۵، حاشیہ ٦)

ایک جگہ لکھا ہے کہ الاشباہ میں بالقرینین تھا جس کی تصحیح دیوان سے کرکے بالقرینین کردیا گیا ہے (ص ۴۹، حاشیہ ۱)، اسی طرح المغتالین لابن حبیب سے متن میں تصحیح کرکے لا شل بنایا ہے جو اصل میں لا شک تھا۔ (ص ۵۰، حاشیہ ۱۰)

افادات میمنی: الاستاذ عبدالعزیز المیمنی ہندوستان میں ادب و عربیت کے امام تھے، پروفیسر مختار الدین احمد ان خوش قسمت لوگوں میں ہیں جن کو ان سے بھرپور تلمذ اور استفادہ کا شرف حاصل ہوا ہے، اسی لیے ان کا ادب و عربیت کا ذوق پختہ اور رچا ہوا ہے اور وہ جا بجا اپنی تحقیق و حواشی میں اپنے استاذ کی تحقیقات کے حوالے دیتے ہیں اور کہیں کہیں ان کے افادات سے بھی نقل کرتے ہیں، اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ص ۱۹ کے تیسرے شعر کے متعلق نوٹ میں ان کے افادہ کا ذکر ہے، لکھتے ہیں:

ابوالعلا المعری نے الفصول والغایات (ص ۳۹۶) کسی اعور شاعر سے منسوب کیا ہے اور ہمارے نسخہ حماسہ بصریہ (ص ۶۹۰) میں ابن الدینہ کی طرف منسوب ہے اور یزید بن طثریہ کی جانب بھی اس کی نسبت کی گئی ہے، ہمارے شیخ استاذ عبدالعزیز میمنی کا افادہ یہ ہے کہ یہ صمہ قشیری کا ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اعور تھا، دیکھیے سمط اللآلی (ص ۴۶۳)۔ (ص ۱۹، حاشیہ ۵)

ایک شعر میں فاسترابونی آیا ہے، اس پر مختارالدین احمد صاحب کا حاشیہ ملاحظہ ہو:

قالی کی الامالی، کتاب الزھرہ اور شرح مختار بشار میں "استرابونی" ہے، استاذ عبدالعزیز المیمنی اس کو تصحیف قرار دیتے ہیں اور فاسترابوبی کو صحیح قرار دیتے ہیں، البکری کا بیان ہے کہ ابوعلی قالی کے اپنے خط میں یہ فاسترابوبی "ب" ہی سے تھا۔ (ص ۲۱، حاشیہ ۲)

ص ۴۷ پر خالدیین نے بعض المحدثین (کسی محدث شاعر) کے حوالے سے دو شعر نقل کیے ہیں جو اکثر کتابوں میں کسی معین شاعر سے منسوب نہیں ہے لیکن زھر الآداب ابی محمد تیمی (۳/ ۳۵۰)، سمط اللآلی (ص ۴۴۴) اور الاغانی (۱۷/ ۱/ ۱۲۱) میں ان کو عبداللہ بن عباس بن فضل بن ربیع بن یونس کا بتایا گیا ہے، ہمارے استاذ میمنی فرماتے ہیں کہ "ان کو عبداللہ بن عباس کی طرف منسوب کرنا وہم ہے، یہ دونوں شعر اس قصیدے کے ہیں جو ابو محمد تیمی نے عمرو بن مسعدہ کی شان میں کہے تھے اور یہ عبداللہ بن عباس کی پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے، حصری (۳/ ۲۵۰) کے بیان کے مطابق یہ قصیدہ ۲۳ شعروں پر مشتمل ہے۔ (ص ۴۷، حاشیہ ۱)

مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ استاذ کے اس افادہ کا ذکر کرنے کے باوجود پروفیسر مختارالدین احمد صاحب نے اپنی دوسری فہرست میں ان دونوں شعروں کا قائل عبداللہ بن عباس ہی کو بتایا ہے۔ (دیکھیے ص ۶۲، سطر ۱)

(باقی)

باغِ فرح بخش کے جشنِ افتتاح پر پیش کیے گئے دو نایاب قصائد

(از ملک قمی متوفی ۱۶۱۶ء وصلابت خان دوم متوفی ۱۵۸۹ء)

ڈاکٹر نورالسعید اختر

احمد نگر کی باوقار اور عالی شان نظام شاہی سلطنت اپنے تزک واحتشام، تعمیراتی کاموں اور باغات کاری میں کسی حد تک مغلوں کے مقابل تھی، مغلیہ سلاطین کی طرح نظام شاہی حاکموں کی ادب نوازی اور معارف پروری کے چرچے ہندوستان کی سرحد سے پار جاچکے تھے، چنانچہ جن نام ور علماوشعرا اور صوفیائے عظام اور ماہرین فنون لطیفہ اور معمار ومہندسین نے جوق در جوق نظام شاہی حکم رانوں کی جودوسخا سے فیض یابی کی خاطر احمد نگر کا رخ کیا، ان میں شاہ طاہر، ملک قمی، ظہوری ترشیزی، دہدار فانی اور مولانا صیرفی جیسے مدبر ودانش ور اور شعرا کے علاوہ نعمت خان سمنانی جیسے ماہرفن معمار اور وزیر مملکت صلابت خان (دوم) کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

مغل شاہنشاہ جلال الدین اکبر کی طرح نظام شاہی بادشاہوں کے بھی ایران سے دوستانہ اور سفارتی تعلقات تھے، چنانچہ شاہ طہماسپ نے ایک سفارتی وفد کے ساتھ ایک نادر پیش کش سولھویں صدی کے اواخر میں احمد نگر روانہ کی تھی، اس پیش کش میں نوادر کے علاوہ شمالی افریقہ کے ایک قبیلہ کا لیبیائی نژاد بہادر اور حوصلہ مند نوجوان بھی تھا، اس کا پورا نام شاہ قلی شہاب خان تھا، موضع تتلم نزد موضع اجنٹا (ضلع اورنگ آباد) میں واقع قلعہ کے دروازے پر جو کتبہ آویزاں ہے اس پر قلعے کے علاوہ اور دیگر عمارتوں کے ساتھ ایک مسجد تعمیر کرنے والے کا نام ان الفاظ میں کندہ ہے "شاہ قلی شہاب خان، صلابت خان دوم" (۱)، (مقالہ از شیخ چاند حسین بہ عنوان

ایل، آئی، ایف ۱/۷۰، اندھیری ایسٹ، ممبئی ۹۳۔

" صلابت خان دوم)۔

تاریخ شہابی کے مصنف نے شاہ قلی شہاب خان کو صلابت خان گرجی (اول) کا بھتیجہ قرار دیا ہے، شہابی رقم طراز ہے:

" برادر زادۂ صلابت خان کلاں را بہ خطاب صلابت خان سرفراز فرمود وخلعت وزارت دادہ مختار کل در سلطنت خود نمود"۔ (ص ۳۰، تاریخ شہابی موسوم بہ مژدۂ احمد نگر، فوٹو کاپی فراہم کردہ از جناب اسلم مرزا اورنگ آبادی)

صلابت خان (دوم) نے اعلا منصب پر فائز ہوتے ہی سیاسی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے ملک کے اندرونی خلفشار کو ختم کیا، دشمنوں سے نجات پائی اور پھر اپنی لیاقت وذہانت اور دیانت وشجاعت اور انتظامی شعور کے ایسے جوہر دکھائے کہ دیکھتے ہی دیکھتے نظام شاہی سلطنت ایک مستحکم اور خوش حال حکومت بن گئی، عوام کی آسائش و بہبود کے لیے صلابت خان دوم نے آم اور اِملیوں کے درخت شاہ راہوں کے کنارے لگوائے، راستوں پر سرائے اور جگہ جگہ سرسبز باغوں سے ہر جانب شادابی اور آبادی نظر آنے لگی، افسران چھوٹے چھوٹے جرائم پر بھی سختی سے پیش آتے جس کی وجہ سے ملک سے چوروں، لٹیروں، بدمعاشوں، منافع خوروں اور جبر وتشدد سے روپیہ وصول کرنے والوں کا خاتمہ ہوگیا، پاتھری روڈ پر واقع تس گاؤں سے قصبہ بھنگار کی پہاڑیوں تک صلابت خان (دوم) نے ایک نہر بھی کھدوائی تھی تاکہ عوام اور باغِ فرح بخش کو سیراب رکھا جاسکے، احمد نگر کا بھاتوڑی تالاب بھی صلابت خان (دوم) کا فلاحی کارنامہ ہے، خود اس کا مقبرہ فن تعمیر کی عمدہ مثال ہے، صلابت خان (دوم) کی انتظامی اور فلاحی کارگزاریوں سے نظام شاہی سلطنت کی عظمت نکھرتی چلی گئی۔

نظام شاہی سلاطین کو مغلوں کی طرح باغات کاری کا شوق تھا، ملک احمد نظام شاہ اول (۱۴۹۶ تا ۱۵۱۰ء) نے قصبہ بھنگار احمد نگر کے قریب بہمنی تاج دار کو فیصلہ کن شکست دی تھی، اس معرکہ میں فتح یابی کی خوشی میں نظام شاہ نے باغ نظام کی بنیاد رکھی تھی، نظام شاہ بحری کے انتقال کے بعد برہان نظام شاہ اول (۱۵۱۰ء تا ۱۵۵۳ء) نے حکومت کی، برہان نظام شاہ نے باغ نظام کے اطراف حصار بنوائی اور اس کا نام " باغ بغداد" رکھا۔

۱۵۵۳ء میں مرتضیٰ نظام شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا، خواجہ میرک دبیر ملقب بہ چنگیز خان وزیر مملکت نے مرتضیٰ نظام کی ایما پر قصبہ بھنگار ہی میں ایک سائبانی باغ کی تعمیر کا کام ماہر ایرانی مہندس اور معمار نعمت خان سمنانی کے سپرد کیا تھا، شاہی فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے نعمت خان سمنانی نے ۹۸۴ھ مطابق ۷۵-۱۵۷۶ء میں سائبانی عمارت کا باغ تعمیر کردیا، مرتضیٰ نظام شاہ نے صلابت خان (دوم) کی ہم رکابی میں باغ فرح بخش کا معائنہ کیا، نامعلوم وجوہات کی بنا پر مرتضیٰ نظام شاہ کو بہ قول مورخین سائبانی باغ کی مثلث نما چھتری کی کمانیں ناگوار گزریں، یہ بھی ممکن ہے کہ مرتضیٰ نظام شاہ کو ایرانی باغوں اور مغلیہ باغبانی کی چھب ڈھب نظر نہ آئی اور حاسدوں نے بغض و کینہ سے کام لے کر بادشاہ کے کان بھر دیے ہوں، بہرکیف مرتضیٰ نظام نے اپنے معتبر وزیر مملکت صلابت خان (دوم) کو تیار شدہ باغ کی جگہ نیا باغ بنانے کا فرمان جاری کیا۔

کسی نامعلوم شاعر نے نعمت خان سمنانی کی نگرانی میں تعمیر کردہ باغ کی تکمیل پر تاریخی قطعہ قلم بند کیا تھا، جس کا حوالہ تاریخ فرشتہ میں دست یاب ہے، تاریخی قطعہ ملاحظہ کریں:

نامِ ایں از خوبیِ آب و ہوا　　شد فرح بخش ایں چنیں مشہور باد
بود نعمت خان ساعی بنا (کذا)　　سعی ہائے او تا ابد مشکور باد
خاستم تاریخش از پیر خرد　　گفت یارب تا ابد معمور باد (۱)

۹۸۴ھ / ۱۵۷۵ء

صلابت خان (دوم) نے بادشاہ وقت کے حکم کی تعمیل کی اور باغ فرح بخش کی بنیاد ایرانی طرز تعمیر اور معیار پر رکھی، صلابت خان (دوم) نے اس باغ کی تاسیس میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کردیں، تس گاؤں سے بھنگار تک پہاڑیوں کا سینہ چیر کر آب رسانی کے لیے ایک نہر کھدوائی، باغ کا نقشہ تجربہ کار مہندسوں سے بنوایا، بادشاہ سے اس پر رضامندی حاصل کی، بیرون سلطنت سے ماہرین فن معمار اور شجر کاری کے لیے باغبانوں کا انتظام کیا، باغ کی عمارتوں خصوصاً عشرت کدہ کی دیواروں پر پچی کاری کروائی اور اس کے روشن دانوں میں رنگ برنگے بلور لگوائے، دائرے دار

(۱) تاریخ مژدۂ احمد نگر معروف بہ تاریخ شہابی میں اس قطعہ کا قائل شاہ طاہر تحریر ہے لیکن تاریخ شہابی ہی میں شاہ طاہر کی وفات کا سن ۹۵۶ھ درج ہے، لہٰذا شہابی کا بیان مشکوک ہے۔

چوگوشوں اور مخروطی کمانوں میں فانوس اور قمقمے آویزاں کیے، جب ان پر سورج کی کرنیں پڑتیں تو پوری عمارت میں جیسے قوس قزح کے رنگ بکھر جاتے، یہ نظارہ دیکھنے والوں کے لیے ہوش ربا اور فردوس بریں کی جھلک سے کم نہ ہوتا تھا۔

تاریخی حوالوں کے پیش نظر صلابت خاں دوم کو نعمت خان سمنانی کے بنائے ہوئے باغ کو ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء کے بعد ہی مسمار کر کے اس کی دوبارہ تاسیس کا کام شروع کرنا اور اپنے عہدے کی مصروفیات اور سیاسی مسائل کو مدبرانہ طور پر حل کرتے ہوئے باغ فرح بخش کو ایک مثالی باغ کا مقام عطا کرنا تھا، ایرانی باغوں کی طرز تعمیر کے نقوش اس کے دل و دماغ پر مرتسم تھے، لہذا وہ ماہر معماروں اور تجربہ کار کاری گروں کی تلاش و جستجو میں رہا کرتا تھا، دوسری طرف اسے بادشاہ وقت مرتضیٰ نظام شاہ کے مزاج خسروانہ کی نزاکت کا خیال بھی رکھنا تھا، کیونکہ وہ کچے کان کا بھی تھا، صلابت خاں دوم کے سیاسی دشمن اس کے اقتدار اور روز مرہ بڑھتے ہوئے مناصب سے حسد کرنے لگے تھے، بادشاہ وقت کی فیاضیاں اس حد تک تھیں کہ اس نے اپنی غیر موجودگی میں صلابت خاں دوم کو قلعہ کا نگراں تک مقرر کر دیا تھا، صلابت خاں دوم کی یہ قدر افزائی امرا اور وزرا کو ایک آنکھ نہ بھائی اور وہ آئے دن صلابت خاں کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے لگے، اس دوران دو واقعے ایسے پیش آئے جن سے حاسدین کی کوششوں کو تقویت ملی، پہلا واقعہ بیجاپور کے عادل شاہیوں سے شولاپور کے معاملے پر شکست فاش کا ہونا تھا اور دوسرا معمر مرتضیٰ نظام کے بیٹے برہان نظام شاہ (۱۵۹۱ء تا ۱۵۹۵ء) کی بغاوت تھی، مرتضیٰ نظام شاہ اپنے بیٹے سے بہت خائف تھا اور اس کو راستے سے ہٹانے کے لیے صلابت خاں کو تاکید بھی کر چکا تھا لیکن صلابت خاں دوم کسی مصلحت کے تحت اس کے اس حکم کی تعمیل نہ کر سکا تھا۔

ان سیاسی حالات اور کشیدہ تعلقات میں ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں باغ فرح بخش دوبارہ تعمیر ہو گیا، مرتضیٰ انجو نامی شاعر نے باغ فرح بخش کی از سر نو تاسیس پر ایک تاریخی رباعی منظوم کی۔

ارباب نشاط را خبر کن شاہا
برباغ فرح بخش گذر کن شاہا

نعمت خاں را از بہر تاریخ بنا

۱۲۱۱

تعمیہ ۲۲۰۱ از باغ فرح بخش بدر کن شاہا

-۱۲۱۱ ۲۲۰۱

۹۹۰ھ

فردوس نشاں، بے نظیر باغ فرح بخش کی ازسرنو تاسیس وتکمیل میں تقریباً سات سال لگے، صلابت خان کو یہ ذمہ داری ۹۸۴ھ مطابق ۱۵۷۶ء میں سونپی گئی تھی اوراس نے ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۳ء میں اپنا فرض ادا کردیا، اس کامیاب ادائے فرض میں ایک شایان شان جشن افتتاح کا انعقاد لازمی تھا، ظاہر ہے کہ شاہی پیمانے پر جشن افتتاح کی تیاریاں کی گئی ہوں گی، وزیروں، امیروں، منصب داروں، سرداروں، دیگر افسرانِ اعلا کے علاوہ اس جشن میں عوام کی شرکت اور باغ فرح بخش کی مدح میں شعرا کے قصیدوں اور تزک واحتشام کے شاہانہ مظاہر کا اندازہ لگانا دشوار نہیں، اس موقع پر استاذ الشعرا ملک قمی نے مرصع ومسجع قصیدہ پروقار اور سحر انگیز انداز میں پڑھا تھا، ملک قمی کے پرشکوہ الفاظ، برجستہ تراکیب، نادر تشبیہات اور استعارات و تلمیحات نے تحسین وآفریں کی صداؤں سے پرشور جس سماں کو باندھا ہوگا، چشم تصور سے اسے دیکھا جاسکتا ہے، اس قصیدہ کی سماعت کے بعد دیگر شعرا نے اپنے قصائد کو ضائع کردینا ہی مناسب سمجھا تھا، جن میں مولانا صیرفی بھی شامل تھے، ان کی اس حرکت سے صلابت خاں (دوم) ناخوش ہوا کیوں کہ وہ شعروادب کا دل دادہ اور سخن گوئی میں یکتا تھا اوراس نے خود بادشاہ کی ایما پر اپنا شان دار قصیدہ بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔

ذیل میں استاذ الشعرا ملک قمی کے مختصر تعارف کے بعد تاریخ فرشتہ، برہان مآثر از طباطبائی، مرحوم شیخ چاند حسین کے مقالہ ''صلابت خان دوم'' مقالہ دوم'' احمد نگر کی چند معروف علمی وادبی شخصیات، تاریخ شہابی معروف بہ مژدۂ احمد نگر اور ڈاکٹر عمر خالدی کے بصیرت افروز مقالہ ''دکن سے ہندوستان تک، دکن اور بیرون دکن کے باغات'' سے استفادے کے ساتھ ملک قمی کے بیس

مدحیہ اشعار پیش کیے جا رہے ہیں، افسوس ہے کہ راقم کو کلیات ملک قمی کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا جو اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد (دکن) میں محفوظ ہے۔

ملا ملک قمی (متوفی ۱۶۱۶ء) قم (ایران) سے مغل اعظم جلال الدین اکبر کے زمانے ۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء میں ہندوستان آئے تھے، وہ سیدھے احمد نگر پہنچے جہاں ان کے قدرداں دہدار فانی اور شاہ طاہر نظام شاہی حکم رانوں کی معارف پروری سے فیض یاب ہو رہے تھے، احمد نگر میں ملا ملک قمی کا بہ حیثیت سخن گو خاطر خواہ خیر مقدم کیا گیا، شاہی دربار میں ان کی پذیرائی ہوئی، جہاں انہیں "ملک الکلام" کا خطاب دیا گیا، کچھ عرصہ بعد ملا ظہوری ترشیزی بھی احمد نگر چلے آئے اور ملا ملک کے مہمان ہوئے، ملا ملک ظہوری ترشیزی کے تبحر علم سے بہت متاثر ہوئے، ملا ظہوری کو نثر و نظم کے علاوہ فن کتابت میں مہارت حاصل تھی، معارف پرور مرتضیٰ نظام شاہ نے ان دونوں عبقری ہستیوں کو بلند ترین درجات سے نوازا، ملا ملک نے ظہوری ترشیزی کو اپنی دامادی کا شرف بھی بخشا لیکن جب نظام شاہی حکومت رو بہ زوال ہونے لگی تب یہ دونوں بیجاپور دربار سے منسلک ہوگئے اور یہاں بھی ان کی حسب مراتب پذیرائی ہوئی، ایک عرصہ تک بیجاپور میں رہ کر بالآخر یہ دونوں مغلیہ دربار سے وابستہ ہوئے جہاں ۱۰۲۵ھ مطابق ۱۶۱۶ء میں شہنشاہ جہاں گیر کے دور میں ملک قمی نے انتقال کیا، ملا ملک قمی کا کلیات اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد نزد عثمانیہ یونی ورسٹی میں محفوظ ہے، افسوس ہے کہ راقم اب تک اس کے استفادے سے محروم ہے، ذیل میں ملک قمی کا مرصع قصیدہ پیش ہے جس کے تعارف میں ڈاکٹر عمر خالدی رقم طراز ہیں:

> The inauguration of the garden was the occasion for a virtual Mushaira, or poetry recited by a number of poets, Malik Qummi's poem read at the inaugural of the garden certainly evokes an atmosphere of enjoyment enhanced by the frgrance of scented flowers.

(مقالہ از ڈاکٹر عمر خالدی، ص ۶)

دراصل مغلوں اور نظام شاہیوں کے یہاں باغات اور سائبانی عمارتوں اور عشرت کدوں کی تعمیر شاہانہ شان وشوکت کے اظہار کے مقصد سے ہوتی تھی لیکن احمد نگر کے سنگلاخ علاقہ کی زمین، ایران کی مٹی کی طرح زرخیز نہیں تھی، اس لیے یہاں کے باغوں میں اس شادابی کی کچھ کمی تھی جو ایرانی اور مغلیہ باغوں کی خصوصیت ہے۔

جلال الدین اکبر کے ملک الشعرا فیضی نے اپنے ایک سفر کے دوران صلابت خان (دوم) کے لگائے ہوئے باغ کو دیکھا تھا، فیضی اپنے مکتوبات میں صرف اتنا اشارہ کرتا ہے کہ "صلابت خان (دوم) نے اونچے اونچے سَرو کے درختوں کے درمیاں ایک خوش نما باغ شہر (احمد نگر) سے باہر بنوایا تھا، جس کے درمیانی حصے میں ایک بڑے حوض پر سائبانی چھت سایہ فگن تھی، اس خطہ کی ہوا خوش گوار تھی لیکن اچھے قسم کے خربوز (تربوز) مہیا نہیں تھے، چمپا اور دیگر ہندوستانی پھول وہاں کثرت سے فراہم تھے"، (انشائے فیضی مترجمہ مظفر عالم اور سنجے سُبرامنیم)۔

قصیدہ دربارۂ جشن افتتاح باغ فرح بخش از ملک الکلام ملا ملک قمی ۹۹۰ھ مطابق ۸۳/۱۵۸۲ء:

ای تو بہشت بریں ایں چہ شکوہ است و شاں
پیش گہت (۱) شہ نشیں بارگہت شہ نشاں
بزم ترا ہشت خلد شقہ ای از پیشگاہ
بام ترا نہہ فلک پایہ ای از نردباں
کوس تحکم بزن بیں (۲) کہ درختانِ سرو
صف زدہ از چارسو بر صفات (صفت) چاکراں
ہم نمائے (۳) از فیض ازل با گوہرت ہم نشین
ہم گل روی صفا با اثرت تو اماں
تا سپارد (۴) راہ تو کعبہ بغلتد بسر

(۱) گاہت رتاریخ شہابی (۲) ھیں: مقالہ عمر خالدی (۳) ہم نم: مقالہ عمر خالدی (۴) سپرد: طباطبائی۔

تانگردد (۱) سوئے تو چرخ ہیفتہ ستان
سقف تو برباد داد از رفعت خرگاہ چرخ
طاق نو برخاک ریخت آب رخ کہکشاں
سنبل بستان تو صید طرب را کمند
خار گلستان تو چشم حاسد را سناں
چرخ زگرد رہت دوختہ برتن حریر
مشتری از قبہ ات مندہ برسر طالع (۲) ساں
یافت دست قضا از گل سقفت سپر
ساختہ ترک قدر ز ابروی طاقت کماں
از گہر فیض تو ابر بادست صبا
تحفہ فرستد بہ بحر ہدیہ فرستد بکاں
لطف تو گر در خیال بگذرد اندیشہ را
چہرۂ ما فی الضمیر دیدہ بیند عیاں
گر کند ابر و بلند شاہد تصویر تو
خامہ بہزاد را تاب دہد در بناں
غنچہ تصویرت .ارشگفد از ابر کلک
عقدہ کند خندہ را در گلوئے زعفراں
بسکہ زمین نقش بست وصف تو را در ضمیر
می دود از جرم خاک سبزہ بشکل زباں
گر بعناصر دہد لطف (۳) تو سرمایہ ای
خاک دہد مردہ را زندگی جاوداں

---

(۱) نگارد: مقالہ شیخ چاند (۲) ضامن: مقالہ شیخ چاند احمد نگری (۳) سہو کتابت: مقالہ شیخ چاند (لوت تو)۔

فیض ہوایت اگر مایہ دہد باغ (۱) را
ثقل جبلی برد (۲) از تن کوہ گراں
سدہ تو کعبہ وار مامنِ فتح و ظفر
طاق تو محراب وار قبلۂ پیر و جواں
خاک سبک روحت ار سرمہ دہد با درا
بر نظر خاکیان خواب بگردد گراں
کسب ہوا اگر کند باد ز دریاچہ اَت
در بدنِ خاکیاں آب شود استخواں
از در و بامت مدام فیض ازل می دہد
چوں گل عیش از دل خسرو (۳) ہندوستاں

شیخ چاند بن حسین احمد نگری نے صلابت خان دوم کے قصیدے کے اشعار تاریخ شہابی معروف بہ مژدۂ احمد نگر سے اخذ کیے تھے، موصوف نے اس حوالے سے صرف سترہ اشعار اخذ کیے اورانہیں رومن انگلش میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ اپنے مقالے میں پیش کیا، اصلاً اس قصیدے میں اشعار کی تعداد چھبیس ہے، مرحوم شیخ چاند بن حسین نے قصیدے کے جو اشعار نقل کیے ہیں ان میں سہو کتابت کی وجہ سے گیارہواں شعر چھوٹ گیا ہے، شعر نمبر ۱۷ تا شعر نمبر ۲۶ تک کل نو اشعار سہواً یا قصداً نقل ہونے سے رہ گئے، افسوس ہے کہ ان اختتامیہ اشعار میں شاعر کا تخلص نہیں ہے، اغلب ہے کہ اس قصیدے کے مزید اشعار نقل نہ ہو سکے ہوں جو فی الوقت ہماری دسترس سے باہر ہیں۔

ذیل میں صلابت خاں دوم کے دست یاب ۲۶ اشعار تقابلی متون سے تصحیح کے بعد ناظرین کی خدمت میں حاضر ہیں، تاریخ شہابی کا کاتب نہایت کم سواد ہے، لہذا تسامحات کا احتمال ہے۔

ڈاکٹر عمر خالدی نے صلابت خان کے قصیدے کا خلاصہ ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

"Like Qummi, Salabat Khan alludes to the cypress

---

(۱) باد: مقالہ عمر خالدی (۲) بارد: مقالہ شیخ چاند (۳) خسروان: مقالہ شیخ چاند۔

trees and the pond in the middle of the garden. Every where in the garden, the poet informs us, love struck nightingales are singing the tales of seperation from the lover. Most intriguingly, Salabat Khan suggests the garden fit for a *darbur* both for Indian and Turks". (Omer Khalidi (Article) pp5)

قصیدہ در مدح باغ فرح بخش (بھنگار) احمد نگر از علی قلی شہاب خان ملقب بہ صلابت خان (دوم) متوفی ۹۹۸ھ مطابق ۱۵۸۹ء۔

۱- حبّذا ایں منزل فرخندہ فال دل کشا
قبلہ گاہ فلک وملت گہہ ایں (۱) صدق وصفا

۲- مستدر الشکل (۲) سقف او چوں سطح آسماں
مستقیم الوضع دیوارش چوں خطِ استوا

۳- پایہ ہائے گرمی اش بر گوشہ ہائے بام وعرش
چشمہائے روزنش بر روضہ ہائے جاں فزا

۴- گرد بر گردش گلستاں چوں ستانِ (۳) ارم
عندلیب از شوق گل از ہر طرف دستاں سرا

۵- بہر زیور شاخِ گل از سوزنِ باریک خار
تکمہ ہائے غنچہ دوزد بر گریبانِ قبا

۶- درمیان آں ہمایوں روضۂ حوضِ دل فریب (۴)
درمیانِ حوضِ او برجستہ نخلِ دل رُبا

(۱) کعبہ بصدق وصفا، تاریخ شہابی (۲) مصدر الشکل، تاریخ شہابی و عمر خالدی (مقالہ) (۳) گلستانِ ارم، خالدی بحوالہ طباطبائی (۴) خالدی: مصرعہ ندارد (مقالہ خالدی زیر اشاعت)

۷- آں چوں کوثر از کثافتہائے جسمانی بری
دیں چوں شاخِ سدرا(۱) درحسن و لطافت منتہا

۸- روضة فی نعمتها (۲) الرضوان قال هادهی(۳)
جنت الفردوس والانهار تجری تحتها

۹- ساحتِ آئینہ سیمائش با زورِ بزم و یار
جلوہ گاہ لعبتانِ ہند (۴) و مژگانِ خطا

۱۰- تا قیامت گرد باد فتنہ نتواند نشاند
برجبینِ طاق گردوں سایۂ او گرد فنا

۱۱- ہم چوں گچ برزمینِ صنعت گرسحر آفریں (۵)
بہرطرحِ ایں ہمایوں صرحِ مرصوص البناء (۶)

۱۲- شد زیمن پر تو آں خطِ نورانی پدید
امتدادِ کہکشاں بر سقف مرفوع السما (۷)

۱۳- تا پزد گچ بہر او ہر صبح گردوں از صدف
بر فروزد زِ آتشِ خورشید را بادِ صبا

۱۴- عاجِ صبح آبنوسِ شام را پیوند کرد
بہر خاتم بندی دروازہ اَش دستِ قضا

۱۵- بہر جامِ روزنش مے آورد قوسِ قزح
شیشہ ہائے خوب رنگ از گورۂ گرم ہوا (۸)

۱۶- برندارد مہر از روزنِ ایں خانہ چشم (۹) الف

---

(۱) سِدرہا، شہابی (۲) نامی، خالدی (۳) عربی شعر (۴) بتان ہند رعمر خالدی (۵) شعر ندارد، شیخ چاند و خالدی، شعر ندارد (۶) مرفوع البناء، خالدی (۷) عربی: غیر واضح (۸) از روزنِ ایں خانہ چشم رعمر خالدی (۹) الف مصرعہ ندارد رخالدی۔

ماہِ شب منزل کند بر بام ایں عشرت سرا

۱۷- هر دو را مقصودِ اصلی آں که یک راه بنگرند
در گلستانِ جمال خسرو فرماں روا

۱۸- آفتاب عالم افروز سپہر سلطنت
شاہ غازی شیخ برہان بحری لطف و خدا　(۱) ب

۱۹- آں ہمایوں اختری کز ارتفاع منزلت
منزلش رفتہ خرج بہر ما پشت دوتا

۲۰- آں کہ زملک بسے را............(۱) یابد نظام
تا قضا از حکم رایش نمی گردد قضا

۲۱- آں کہ چوں بر رفرفِ اقبال گردد متقی
بہر او استبرق افلاک یابد مُتکا

۲۲- سلطنت او مسند گردوں آسائش مستمند
تخت او اندیشہ انجم میرش (۲) مقتدا

۲۳- مطربانِ بزم او ہر یک بہ آواز پسند (۳)
سائبانِ گلشنش ہر دم بجامِ غم زدا (کذا)

۲۴- می ربایند از دماغ عشق بازاں نقد عقل
می دہند آئینہ رخسارِ ساقی را جلا

۲۵- تابود طبع (۴) غبار (بلند)..........فسادِ فلک
تا شود میل طبع میداد نشا و نما

۲۶- چار باغ ملکش ایمن باد افساد فلک

---

(۱) ب شاہ غازی شیخ برہان بحری ۱۵۹۱ء تا ۱۵۹۵ء، دور حکومت (۱) آب زدہ (۲) سہو کاتب (غیر واضح)
(۳) پسند ر سہو کاتب (بلند ہوسکتا ہے) (۴) طبعی رشیخ چاند وطباطبائی

چار باغ دولتش خوڑم ز بادا (کذا) (۱)

باغ فرح بخش کی موجودہ صورت حال:　　　داخلی شواہد کے مطابق ۱۵۷۳ء / ۱۵۷۴ء اور ۱۵۸۳ء / ۱۵۸۴ء کے درمیان بھنگار (احمد نگر) کے مقام پر باغ فرح بخش دو مرتبہ تعمیر ہوا تھا، اس دیدہ زیب، دل کشا اور اسم بامسمی فرحت بخش باغ کی سرزمین آج بنجر پڑی ہوئی ہے، چاروں طرف پھیلی ہوئی ببول کی جھاڑیوں نے باغ فرح بخش کے وجود کے نشانات تک نابود کر دیے ہیں، صرف احاطے کے درمیان ایک سائبانی عمارت خستہ حالت میں ایستادہ ہے، باغ کے درمیانی حصہ میں واقع حوض اور فوارے ناپید ہیں، البتہ اس احاطے کی خستہ عمارت آج بھی فرح باغ کے نام سے منسوب ہے جو احمد نگر سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہے۔

ایچ، آئی، ایس کنور نے باغ فرح کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے، وہ رقم طراز ہیں:

"فرح باغ ایک عالی شان دو منزلہ سائبانی عمارت ہے جو ۱۵۸۳ء اور ۱۵۸۴ء کے درمیانی وقفہ میں بنائی گئی تھی، یہ عمارت چوگوشہ حوض کے درمیان ایستادہ ہے، اس میں شمالی سمت سے ۲۷ میٹر روش سے داخل ہوا جا سکتا ہے، یہ حصہ تقریباً ۵۵۰ / ۳ مربع میٹر پر محیط ہے، شاہی محل کی عمارت ۲۰۰ فٹ سے کچھ زیادہ طویل ہے جس کے تراشیدہ کونے ناموزوں ہشت پہلو محرابوں پر مشتمل ہیں، جن کی یک طرفہ لمبائی ½۱۴۷ فٹ ہے اور دوسری طرف کی کوتاہی ۳۸ فٹ لمبی ہے، درمیانی چبوترے پر واقع حوض کی گہرائی ۱۵۰ فٹ ہے اور یہ حوض اطراف میں ۵۵۰ فٹ تک پھیلا ہوا ہے، بھنگار سے آنے والی نہر اس باغ کو پانی پہنچاتی ہے، اس حوض کے اختتام پر فرح باغ کے آثار ہیں جس کی دو طرفہ روشوں کے سامنے ہمہ اقسام کے خوشبودار پھولوں کے پودے ہیں"۔ (بحوالہ مقالہ از ایچ، آئی، ایس کنور، فاریا باغ پیلس احمد نگر، جون ۱۹۷۳ء، ص ۲۴ تا ۲۸)

---

(۱) خارج از بحر، نوٹ: راقم نے قصیدے کے دستیاب متون سے اغلاط درست کرنے کی کوشش کی ہے پھر بھی غلطیوں کا احتمال ہے۔

(نوٹ: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کنور صاحب فارسی سے نابلد تھے، شاید اسی لیے انھوں نے فرح باغ کو فاریا باغ تحریر فرمایا ہے)۔

باغ فرح بخش کی حقیقت اور ماہیت پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر کنور رقم طراز ہیں کہ "کیا یہ باغ مغلوں کے کلاسیکی چہار باغ کے مانند تھا؟ اس سوال کے جواب کو مدلل ثابت کرنے کے لیے لکھتے ہیں کہ شمال مغربی ودکنی ٹاپو کی سرزمین اس قدر زرخیز نہیں ہے کہ جس میں تیموری طرز کے سرسبز وشاداب باغات کا تصور کیا جاسکے اور اس قسم کی باغات کاری کے فن سے اس بنجر علاقے کے لوگ یا باغبان ناواقف ہیں، اگر اس علاقہ کی آثار قدیمہ والے گہری کھدائی کریں تو صحیح سراغ پاسکتے ہیں۔

ہندوستان میں شہری حدود سے باہر ایک خوبصورت باغ کی تعمیر دکنی سلاطین کا شیوہ رہا ہے، ان بادشاہوں نے اپنی تخت نشینی، فتوحات اور شاہی شادیوں کی یادگار کے طور پر قلعے، محلات، مقبرے اور باغات بھی بنائے ہیں، نظام شاہی حکم رانوں کے لیے "باغ فرح بخش" روزمرہ کی مصروف زندگی اور خطرات کے تناؤ سے فرار کی، فرحت بخش اور محفوظ جگہ تھی جہاں عشرت وشادمانی کے سارے سامان مہیا تھے، اس کی خوبصورتی، تعمیراتی فن میں منعکس ہوتی ہے، اس کی شان و عظمت بے نظیر شعرا کے کلام سے ظاہر ہے ملک الکلام ملا ملک قمی نے باغ فرح بخش کے جشن افتتاح پر شاندار قصیدہ پڑھ کر سامعین کی خوشیوں اور چاروں طرف کھلے ہوئے پھولوں کی عطر بیزی کو دوبالا کردیا تھا اور اس کی بھینی بھینی خوشبو آج بھی اس قصیدے میں موجود ہے، بہ قول فیضی:

> "مغلوں کے مزاج میں باغات کاری کا تصور جاگزیں تھا، کیوں کہ وسط ایشیا سے آنے والے فارسی داں مہمانوں کے لیے یہ بہت ضروری تھا، ان کی خاطر داری کے لیے پھول اور پھل لازمی تھے جن کا ہندوستان میں فقدان ہے، (تربوز، انار اور گلاب عنقا ہیں)"۔ (از مکتوبات فیضی)

ہندوستانی بادشاہوں کے نزدیک باغات، شاہی تقریبات، رسموں، دعوتوں اور خصوصی جشن منانے کے لیے استعمال ہوئے ہیں، ہمارے ذہنوں میں باغات کا تصور ایک عشرت کدہ سے زیادہ نہیں ہے جہاں ثروت مند دادعیش دیتے ہیں اور عوام سیر سپاٹے سے لطف اندوز ہوتے

ہیں، دکن کے مسلمان سلاطین کے یہاں باغات کاری کا عمل جاری رہا، البتہ دکنی سلاطین کے یہاں مقبری باغات کا تصور نہیں کے برابر ہے۔

تسخیر احمد نگر اور باغ فرح بخش: ۱۶۳۶ء میں مغلوں نے نظام شاہی پایہ تخت احمد نگر پر قبضہ کر کے نظام شاہی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور وزرائے سلطنت سلطنت مغلیہ میں ضم کر لیے گئے، جیسا کہ پچھلی نصف صدی سے دکنی ریاستوں میں ہوتا چلا آرہا تھا، ۱۶۲۸ء تا ۱۶۳۰ء مغلیہ ولی عہد (شاہ جہاں) شہنشاہ جہاں گیر کے خلاف بغاوت کے دوران اسی علاقہ میں پناہ گزیں تھا(۱)، اس بات کا قوی احتمال ہے کہ اس زمانے میں مستقبل کے شہنشاہ (شاہ جہاں) نے باغ فرح بخش کی سیر کی ہو اور اس باغ کے تاثر نے شاہ جہاں کو اپنے آیندہ منصوبے "تاج محل" کا محرک بنایا ہو۔

بہرکیف اس کے علاوہ ایسے تاریخی شواہد دست یاب ہیں جن میں باغ فرح بخش کو سراہا گیا ہے، ایسا ہی ایک مراسلہ نانا صاحب پیشوا کے نام ۱۷۵۹ء میں تحریر کیا ہوا دست یاب ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "باغ فرح بخش بود و باش کے لیے صحت افزا مقام ہے"۔(۲)

سونی پشکر نے ۱۸۳۱ء اور ۱۸۸۱ء کے درمیان برطانوی نو آبادیاتی دور کے سرکاری دستاویزات ڈھونڈ نکالے ہیں، ان دستاویزات کے مطابق باغ فرح بخش کے احاطے میں چینی مزدوروں کی مدد سے شہتوت کے درختوں کی کاشت جاری رہی، تاکہ ہندوستان میں ریشم کی صنعت کو رواج دیا جاسکے، ان سرکاری دستاویزات میں سائبانی عمارت کو اس خطۂ باغ میں نمایاں طور پر دکھایا گیا ہے، جو کہ ایک جھیل کے درمیان فواروں سے گھری ہوئی تھی۔(۳)

۱۸۸۴ء کے بمبئی پریسیڈنسی گزیٹیر میں درج ہے کہ "درختوں کی اچھی خاصی تعداد جو یا تو صلابت خان دوم (۴) کے عہد کے صدیوں بعد دوبارہ کاشت کیے گئے یا پھر مرور زمانہ کے بعد باقی بچ رہے، اس احاطے میں نظر آتے ہیں...... ۱۹۰۹ء میں شعبہ آثار قدیمہ کے سروے کے

---

(۱) مغل امپائر از جان ایف رچرڈس: (کیمبریج یونی ورسٹی پریس) ۱۹۹۳ء (۲) سونی پشکر کا مقالہ بہ عنوان "باغات کی تاریخ اور دکن میں باغ کاری کا کلچر" سمپوزیم یونی ورسٹی آف حیدرآباد، ۲۲، ۲۵/ جنوری ۲۰۰۷ (۳) ایضاً (۴) صلابت خان دوم، اسلامک کلچر ۱۲۰۸ھ/ ۱۹۴۴ء، ص ۱۸۷ تا ۲۰۰۔

مطابق باغ کی اس سائبانی عمارت کو محفوظ تاریخی عمارتوں کے زمرے میں شامل کرلیا گیا لیکن باغ فرح بخش کے احاطے کی قسمت اور ہی تھی''۔

بالآخر بیسویں صدی کے ابتدائی دہے میں ہندوستانی افواج کے ریماؤنٹ ڈیپارٹمنٹ نے باغ فرح کی زمین کو مکئی کی کاشت کے لیے مختص کردیا، شعبہ آثار قدیمہ کی اطلاع کے مطابق جو تصویر دی گئی ہے، اس میں باغ فرح بخش میں لاتعداد درختوں کے ساتھ ایک حوض صاف نظر آتا ہے، البتہ اس تصویر میں باغ جیسے آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

۱۹۸۲ء میں جب راقم (عمر خالدی) نے ڈاکٹر مرحوم ضیاء الدین ڈیسائی کے ہم راہ پہلی مرتبہ باغ فرح بخش کے احاطے میں واقع سائبانی عمارت کا مشاہدہ کیا تھا، جہاں حسب توقع آم ،املی اور کویٹ (wood apple) کی بجائے ببول بن کے سوا کچھ بھی نہیں تھا، (مقالہ از عمر خالدی) اور اب تو باغ کے آثار بھی نابود ہو چکے ہیں، پشکر سونی صاحب نے خبر دی ہے کہ ''باغ فرح بخش کی زمین کا کچھ حصہ کیولری ٹینک میوزیم اور ہندوستانی افواج کے بکتر بند بیڑے کی تحویل میں ہے اور بقیہ حصہ میں جنرل بی، سی جوشی نے ایک اسکول قائم کردیا ہے۔

مآخذ

(قصیدے کا متن مندرجہ ذیل حوالوں پر مبنی ہے)۔

(۱) مقالات شیخ چاند حسین، الف (صلابت خان دوم) مطبوعہ اسلامک کلچر حیدر آباد، ۱۹۴۴ء، ص ۱۸۷ تا ۲۰۰ ۔(۲) ایضاً، (احمد نگر کی چند ادب نواز ہستیاں: تین قسطیں) ۱۹۴۰ء بلیٹن، دکن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونا۔ (۳) مژدۂ احمد نگر معروف بہ تاریخ شہابی، ص ۳۰ تا ۳۴، فوٹو کاپی بہ شکریہ جناب اسلم مرزا صاحب اورنگ آبادی (۴) مقالہ بہ عنوان ''دکن تا ہندوستان، دکن اور بیرون دکن کے باغات'' از ڈاکٹر عمر خالدی۔(۵) راقم کا مقالہ: احمد نگر کا باغ فرح بخش، ص ۵-۱۷، قومی زبان، کراچی، جون ۲۰۰۶ء (نوٹ): ۱- مرحوم شیخ چاند حسین صرف سولہ اشعار کا متن رومن تحریر میں دے سکے ہیں، مقالہ کی ٹائپنگ کے دوران متن میں غلطیاں ہوگئی ہیں۔ ۲- راقم کا مقالہ اور قصیدے کا متن بڑی حد تک شیخ چاند مرحوم کے مقالے اور دیگر تاریخی کتب پر

مبنی تھا لیکن اس میں بھی اغلاط ہیں۔ ۳- پروفیسر شیخ چاند مرحوم نے ملک قمی اور صلابت خاں (دوم) کے قصائد "مژدۂ احمد نگر معروف بہ تاریخ شہابی سے اخذ کیے تھے، راقم کو تاریخ شہابی کا متن جناب اسلم مرزا صاحب کے توسط سے حاصل ہوا، تاریخ شہابی بڑی تقطیع پر تحریر ہوئی ہے، کاتب نہایت کم سواد ہے، نثر اور نظم ایک ساتھ تحریر ہے، خط نستعلیق ضرور ہے لیکن متن اور نقل میں بے شمار اغلاط ہیں اور حوالے بھی مفقود ہیں، البتہ اس میں صلابت خان (دوم) کے قصیدے میں شیخ چاند مرحوم کے رومن متن سے مزید آٹھ اشعار ہیں، اس طرح صلابت خان دوم کے قصیدے کے اشعار کی تعداد ۲۶ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار برہانی معاصر از طباطبائی اور تاریخ فرشتہ میں بھی نہیں ہیں جو اس دور کے چشم دید ماخذ ہیں، اٹھارہویں شعر میں شاہ غازی برہان نظام شاہ کا حوالہ ہے: آفتاب عالم افروز سپہر سلطنت شاہ غازی شیخ برہان.....لطف وخدا

(۱۵۱۰ء تا ۱۵۵۳ء، برہان نظام شاہ اول)

۴- جناب عمر خالدی صاحب کے مقالہ میں قصائد کا متن سہو کتابت اور متنی اغلاط کا شکار ہے، صلابت خان دوم کے قصیدے میں دو مصرعے اور ایک شعر بھی نقل ہونے سے رہ گیا ہے۔

(۶) گلشن ابراہیم، تاریخ فرشتہ از ابوالقاسم ہندوشاہ (جلد دوم)، ص ۱۴۳، بمبئی (۱۸۳۱ء-۱۸۳۲ء) باغ نظام کا ذکر ہے۔ (۷) برہان معاصر از محمد علی طباطبائی (آم اور املی کے درختوں کا ذکر)۔ (۸) باغ (کے موضوع پر تفصیلات دیکھیے، انسائیکلوپیڈیا ایرانیکا، مقالہ از ولیم، ایل، ہناوے، ۱۹۸۲ء، ص ۳۹۵۔ (۹) فاریا باغ پیلیس احمد نگر، ایچ، آئی، ایس کنور، مہاراشٹر پریچے، جون ۱۹۷۳ء، ص ۲۴ تا ۲۸۔ (۱۰) برہان معاصر از سید علی طباطبائی، مرتبہ سید ہاشمی، حیدرآباد مجلس مخطوطات فارسیہ، ۱۹۳۶ء، ص ۳۹-۵۳۸۔ (۱۱) احمد نگر کی چند معروف ادبی شخصیات (مقالہ انگریزی) از مرحوم شیخ چاند ابن حسین، بلیٹن آف دی دکن کالج اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۴۰ء (متن سہو کتابت سے بھرپور ہے)۔ (۱۲) سونی پشکر مقالہ بہ عنوان: باغات کی تاریخ اور دکن میں باغات کاری کا کلچر، سمپوزیم یونی ورسٹی آف حیدرآباد، ۲۲-۲۵، جنوری ۲۰۰۷ء۔ (۱۳) مغل امپائر از جان، ایف رچرڈسن، ۱۹۹۳ء۔

قرآن کا معجز بیانی اور شاعروں کا عجز

جناب شمیم طارق صاحب

قرآن حکیم کے شعر نہ ہونے کا اعلان خود قرآن حکیم نے کیا ہے، اس لیے قرآنی آیات کو شعر ثابت کرنے ، ان میں شعری محاسن تلاش کرنے ، کسی انسانی تخلیق کو قرآن حکیم کا مماثل قرار دینے یا کسی زبان کے فن پارے کو اس زبان کا قرآن تسلیم کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے، قرآن پر ایمان لانے والوں کے لیے تو یہ یقین کافی ہے کہ قرآن اللہ کا کلام، مومنوں کے لیے کتاب بشارت اور متقیوں کے لیے کتاب ہدایت ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خود مسلمان جو قرآن حکیم کے ہر حرف ولفظ پر ایمان لانے کے مدعی ہیں قرآن حکیم کے اس اعلان کے باوجود کہ وہ شعر نہیں ہے کسی فن پارے کو اس زبان کا قرآن قرار دینے کے علاوہ قرآنی آیات میں شعری اوصاف ومحاسن کی نشان دہی بھی کرتے رہے ہیں، مثلاً:

انھوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر مولانا جامیؔ کے اس خیال واحساس کو قبولیت و تقویت عطا کی ہے کہ

مثنویِ مولویِ معنوی
ہست قرآں در زبانِ پہلوی

لَا حَولَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کو رباعی کا اصل وزن تسلیم کیا ہے، لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کو فاعلات فعلن فاع کا ہم وزن ہونے پر اصرار کیا ہے، اسی طرح انا اعطینٰکَ الکَوثَر ، لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا کے اجزا کو اور اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ کو مکمل مصرع قرار دیا ہے، فارسی کے اہم شاعروں نے بسم اللّٰه الرحمن الرحیم کو بغیر کسی اضافے کے یا کسی سبب و وتد

فلیٹ نمبر ۲۷، مرزبان منشن، فروٹ مارکیٹ بائیکلہ، ممبئی۔

کے اضافے کے ساتھ نہ صرف مصرع تسلیم کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک مصرع شامل کر کے اس کو مکمل شعر میں تبدیل کرنے کی کئی مثالیں چھوڑی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
ہست کلید در گنجِ حکیم — نظامی گنجوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
موجِ نخست است ز بحرِ قدیم — عرفی شیرازی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
تازہ نہالی ست زباغ قدیم — فانی کشمیری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
تیغ سیاہ تاب رسول کریمؐ — آزاد بلگرامی

تعالیٰ مالک الملک قدیم
کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — شیخ عطار

قرآن حکیم کی آیات کو کلی یا جزوی طور پر شعر کا حصہ بنانے میں اردو شعرا، فارسی شعرا کا اتباع کرنے کے علاوہ بہت کچھ اختراع بھی کرتے رہے ہیں اور ان اردو شاعروں میں ہر مکتب فکر کے شاعر شامل ہیں، مثلاً اقبال کی شاعری میں تو جس کا بنیادی حوالہ قرآن ہے، قرآن حکیم کی کسی آیت کی تفہیم یا من وعن آیت یا آیت کے کسی جزو کے شامل ہونے کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں ہی، غالب سے فیض احمد فیض تک کئی ایسے شاعروں کے کلام میں بھی یہ مثالیں موجود ہیں جن کی فکر اور شخصیت کا بنیادی حوالہ تعقل اور تشکیک ہے، مثلاً غالب نے بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں اس مقصد سے جو منظوم عریضہ (قصیدہ) پیش کیا تھا کہ چھ چھ ماہ پر ملنے والی تنخواہ ہر ماہ ملنے لگے، اس میں ایک شعر ہے:

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وقنا ربنا عذاب النار

غالب جنت کو "دل کے خوش رکھنے والے خیال" سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، ممکن

ہے وہ جہنم کے بھی قائل نہ رہے ہوں اور انہوں نے بہادر شاہ ظفر کو ڈرانے کے لیے ایک شعر میں اس آیت کریمہ کا استعمال کیا ہو مگر اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے اس آیت کریمہ کا صحیح مفہوم اخذ کر کے اس کو صحیح مقام پر استعمال کیا ہے، اس کے برعکس ان کی ایک غزل کا مطلع ہے:

آپ نے مسنی الضر کہا ہے تو سہی
یہ بھی یا حضرت ایوبؑ گلہ ہے تو سہی

یہاں ''مسنی الضر'' کا مفہوم اخذ کرنے میں غالب سے خطا ہوئی ہے، رب انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین بند، کی التجا ہے اپنے رب سے، یہ گلہ ہرگز نہیں، گلہ کرنے والے کی تعریف نہیں کی جاتی مگر اللہ رب العزت نے حضرت ایوبؑ کی تعریف کی ہے (سورۂ ص: ۴۴)، ان دونوں مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے شعور و لاشعور میں قرآن حکیم کی آیات کے اثرات موجود تھے اور ان اثرات کا اظہار انہوں نے کبھی مثبت انداز میں کیا ہے اور کبھی ان کا اظہار کرنے میں غلطی کی ہے۔

فیض احمد فیض جس فکر و فلسفہ کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں اس میں روحانیت اور قرآن کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے مگر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے شعری مجموعوں میں ''حمد''، ''شورش زنجیر بسم اللہ''، ''دعا'' اور ''ویبقی وجہ ربک'' ایسی کئی نظمیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قرآن سے متاثر تھے اور اپنے اس تاثر کو انہوں نے شعری تجربے میں ڈھالنے میں کامیابی حاصل کی ہے، جس نظم کا عنوان ''ویبقی وجہ ربک'' ہے، اس میں قیامت پر ایمان کی علامات و کیفیات سے استفادہ کرتے ہوئے ان انقلابات عالم کو بھی شامل کر دیا گیا ہے جو اللہ رب العزت کی صفت قہاری کے ظہور کے شاہد ہیں اور جن کے نتیجے میں ظالموں، غاصبوں اور کبر کرنے والوں کے قیامت سے پہلے قیامت سے دوچار ہونے کی یاددہانی ہوتی رہتی ہے، یہ صحیح ہے کہ نظم میں ''قیامت'' اور ''انقلاب'' کا تصور ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے یعنی نظم میں استعمال ہونے والے لفظوں میں معنی کی متعدد ''جہتیں'' اور ''پرتیں''، عقبی اور دنیا دونوں کو محیط ہیں لیکن اس سے فیض کے عقیدۂ آخرت پر فرق نہیں پڑتا، انہوں نے بہت واضح لفظوں میں کہا ہے کہ

وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے

جو لوح ازل میں لکھا ہے

اس نظم کی کیفیت اور اسلوب کو بھی قرآن کو سمجھے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا، کئی مصرعے تو قرآنی آیات کا براہ راست ترجمہ ہیں، ترجمہ نہ تسلیم کریں تب بھی ترجمانی تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا کیوں کہ فیض نے اس نظم میں قیامت کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ قرآن ہی سے ماخوذ ہے، مکمل نظم یوں ہے:

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوح ازل میں لکھا ہے
جب ظلم وستم کے کوہ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہل حکم کے سر اد پر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارض خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہل صفا، مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی

جو منظر بھی ہے ناظر بھی

اٹھے گا انا الحق کا نعرہ

جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اور راج کرے گی خلق خدا

جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

فیض کی ایک دوسری نظم کا عنوان ''شورش زنجیر بسم اللہ'' ہے اور اس نظم میں پاکستان کے سیاسی، سماجی حالات اور ان حالات میں آزمائش کے دراز ہوتے سلسلوں کو انہوں نے جس خوب صورتی اور فنی چابک دستی سے شعری تجربے میں ڈھالا ہے وہ وہی کرسکتا تھا جو اپنی ابتلا و آزمائش کو رومان، رومان کو انقلاب اور انقلاب کو عرفان بنا دینے پر قادر ہو، اس نظم میں بھی ایک ہی لفظ میں معنی کی کئی سطحیں ہیں جو کبھی یہ باور کراتی ہیں کہ ''گنہگار وطن'' سے ارباب اقتدار کی پرسش کا تذکرہ کیا جارہا ہے اور کبھی یہ کہ حشر برپا ہے اور نفسی نفسی میں مبتلا بندگان خدا کے لیے یہ کہتے ہوئے اپنا اپنا نامۂ اعمال قبول کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ

سر دربار پرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی

کرو یارو شمار نالۂ شب گیر بسم اللہ

اس نظم میں قطع نظر اس سے کہ قرآن حکیم کی ایک آیت کا صرف ایک جزو نظم کیا گیا ہے، اس جزو کے استعمال سے جو آہنگ پیدا ہوا ہے، وہ بھی شعریت سے مملو ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو شاعروں نے قرآن حکیم کی آیتوں میں یا کسی آیت کے بعض اجزا میں اوزان و بحور کی ہی تلاش و شناخت نہیں کی ہے بلکہ قرآنی آیات میں موجود صوتی اور شعری آہنگ کی بھی نشان دہی کی ہے، اسی طرح قرآنی تشبیہات، استعارات اور تعبیرات بھی ان کی توجہ کا مرکز رہی ہیں، فیض نے قرآنی آیات کے تمام اوصاف سے جو شاعری کی روح سمجھے جاتے ہیں، بھرپور استفادہ کرتے ہوئے بسم اللہ کی تکرار سے اس نظم میں جو تاثیر پیدا کی ہے وہی اس کا امتیاز ہے، نظم جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی ہے پڑھنے یا سننے والا محسوس کرتا ہے کہ قرآن حکیم کے لفظی اور معنوی اعجاز کی ترسیل کے ساتھ ایک نئی تشریح و تفہیم سامنے آرہی ہے، پوری نظم

یوں ہے:

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرام دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورش زنجیر بسم اللہ

در زنداں پہ بلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں درد دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ

گنوں سب داغ دل کے حسرتیں شوقیں نگاہوں کی
سر دربار پرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمار نالۂ شب گیر بسم اللہ

ستم کی داستاں کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیر لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیے
مصر ہے محتسب راز شہیدان وفا کہیے
لگی ہے حرف ناگفتہ پہ اب تعزیر بسم اللہ
سر مقتل چلو بے زحمت تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ

اردو تخلیق کاروں کے شعور ولاشعور میں مجموعی طور پر بھی یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اگر قرآن حکیم عربی کے بجائے اردو میں نازل ہوا ہوتا تو اس کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر منتخب کی گئی ہوتی یا علامہ اقبال کی نظم، حالاں کہ یہ جملہ یا بات خلاف عقیدہ بھی ہے اور خلاف واقعہ بھی، خلاف عقیدہ اس لیے کہ قرآن حکیم کے اس اعلان کے بعد کہ وہ شعر نہیں ہے کچھ اور فرض کرنے کی ضرورت رہ جاتی ہے نہ گنجائش اور خلاف واقعہ اس لیے کہ قرآن حکیم کی آیات یہی نہیں کہ شعر نہیں ہیں، مسجع، مقفع اور سادہ نثر کے زمرے میں بھی نہیں آتیں، کیوں کہ نثر کے بھی کچھ

تقاضے ہیں اور قرآن حکیم ان تقاضوں سے اتنا بلند و ممتاز ہے کہ اس کو نثر کہنا بھی اس کی معجز بیانی کو محدود کر دینے کے مترادف ہے، اس لیے اس حقیقت پر اصرار ضروری ہے کہ قرآنی آیات ایک ایسی صنف ادب میں ہیں جس کی کوئی مثال نزول قرآن سے پہلے موجود تھی نہ نزول قرآن کے بعد وجود میں آئی، یعنی نوع اور صنف ادب کے اعتبار سے بھی قرآن حکیم ایک معجزہ ہے اور اگر اس معجز نما صنف ادب کا تعارف کرانے کے لیے "منثور نظم" یا "منظوم نثر" جیسی کسی خود ساختہ اصطلاح کا سہارا لیا جائے تب بھی یہ تعارف مکمل نہیں ہوتا، یہ مشکل ان کے سامنے بھی تھی جو قرآن کے اولین مخاطب تھے یا قرآن جن کی زبان میں نازل ہو رہا تھا، سیرت کی کتابوں میں عتبہ بن ربیعہ کے وہ الفاظ محفوظ ہیں جو اس نے نبی رحمتؐ کی زبان مبارک سے قرآن حکیم کی آیات سننے کے بعد کہے تھے، یہ شخص آپؐ کے حضور قریش کا نمائندہ بن کر آیا تھا اور جب واپس ہوا تو اپنی قوم سے کہا کہ "میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ ویسا کلام واللہ میں نے کبھی نہیں سنا، خدا کی قسم وہ نہ شعر ہے، نہ جادو، نہ کہانت"، اس جملے سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ قریش کے عام لوگوں کا تاثر یہ تھا کہ نبی رحمتؐ پر جو کلام نازل ہو رہا ہے وہ شعر، جادو یا کہانت ہے، لہذا عتبہ بن ربیعہ نے جو حرص و لالچ کے ذریعہ آپؐ کو دعوت نبوت سے باز رکھنے کی کوشش میں تھا، اس خیال خام کی تردید کو ضروری سمجھا وہیں یہ بھی ثابت ہے کہ قرآن حکیم کو کوئی نام دینے سے خود اہل قریش بھی عاجز تھے، قرآن حکیم کو شاعری کہنا ان کے عجز اور حیرت کے سبب تھا، دوسرے عرب قبیلوں کے اصحاب ذہن و ذوق بھی قرآن حکیم کو کہانت، شاعری اور ساحری کہے جانے کو غلط سمجھتے تھے، ابوذر غفاریؓ نے قبول اسلام سے پہلے اپنے جس بھائی کو نبی رحمتؐ کی آمد و بعثت کی تحقیق کے لیے مکہ بھیجا تھا، انہوں نے مکہ سے واپس آنے کے بعد اپنے بھائی کو بہت واضح لفظوں میں سمجھا دیا تھا کہ "لوگ آپؐ کو شاعر، کاہن اور جادوگر کہتے ہیں لیکن میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے، آپؐ کا کلام کاہنوں کا کلام نہیں، میں نے آپؐ کے کلام کو انواع شعر پر رکھا تو اب کوئی نہ کہے کہ وہ شعر ہے، خدا کی قسم آپؐ سچے ہیں اور وہ لوگ جھوٹے ہیں"۔

جنوں کی جو جماعت آپؐ پر ایمان لے آئی اس نے بھی اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے قرآن حکیم کو "عجب قرآن" قرار دیا تھا، یعنی قرآن حکیم کی سماعت سے پہلے جنوں نے بھی

کوئی ایسا کلام نہیں سنا تھا جو کسی بھی اعتبار سے قرآن حکیم کے مماثل ہو، اس لیے انہوں نے ''قرآن عجب'' کہہ کر اپنی حیرت کے ساتھ قرآن حکیم کی آیات کو نوع اور تاثیر دونوں اعتبار سے ایسا کلام قرار دیا تھا جس کی کوئی مثال ان کے علم میں نہیں تھی، اس تناظر میں ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا فطری ہے کہ

۱- جب قرآن حکیم شاعری ہونے کا منکر ہے۔

۲- قریش اور دیگر قبائل کے صاحبان ذہن وذوق بھی اس کے شاعری ہونے کا انکار کر چکے تھے اور

۳- جنوں نے بھی ''قرآن عجب'' کہہ کر اس کی انفرادیت کی شہادت دے دی تھی۔

تو پھر مشرکین مکہ کے قرآن حکیم کو شاعری قرار دینے یا بعد والوں کے قرآن حکیم کی آیات میں شعری محاسن تلاش کرنے، قرآنی آیات پر مصرعے لگانے، قرآنی آیات یا ان کے کسی جزو سے اپنی نظم کے لیے شعری آہنگ حاصل کرنے یا ''ہست قرآں در زبان پہلوی'' کہہ کر غیر قرآن کو قرآن کہنے کی جرأت وجسارت کیوں پیدا ہوئی؟ ان سوالوں کے جواب میں ایمان نہ لانے والوں کے حوالے سے جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ جو حقیقتیں پہلے پہل انسان کے سامنے آتی ہیں وہ ان کو ان ہی حقیقتوں کے حوالے سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے، جن سے وہ پہلے سے واقف ہوتا ہے اور اہل قریش چوں کہ اوزان وبحور کی حدود میں رہتے ہوئے جذبات کے اظہار، اوزان و بحور کی پابندی کے بغیر ترغیب، ترہیب، رنج اور مسرت کی صورت گری اور استعارات، تشبیہات اور محاکات سے مملوء کلام کو شاعری کہا کرتے تھے، اس لیے انہوں نے قرآن حکیم کو بھی شاعری سمجھا جو ایسے بہت سے ادبی لسانی اوصاف ومحاسن کا حامل ہے جو اس میں اور شاعری میں مشترک محسوس ہوتے ہیں، وہ اس بنیادی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے کہ قرآن حکیم رشد وہدایت ہے اور شاعری چند استثنائی صورتوں کے علاوہ لفاظی وعبارت آرائی، اس کے باوجود انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ قرآن حکیم بعینہ شاعری ہے، یہی نہیں ان کے صاحبان ذوق نے تو ہمیشہ اس کے شاعری ہونے کا انکار کیا......

لبید بن عاصم کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی چند آیات سننے کے ساتھ ہی اس نے بے ساختہ اعلان کردیا تھا کہ ''یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے''، مسلمانوں کا تو ایمان ہی اس بات پر ہے

کہ قرآن حکیم اللہ کا کلام ہے، وہ اس حقیقت کو بھی جانتے ہیں کہ قرآن حکیم کا انداز شعرائے عرب کے وضع کیے ہوئے اصولوں پر نہیں ہے اور اس میں فصاحت و بلاغت کے اعلاترین معیار کے ساتھ معنویت کو اولیت دی گئی ہے، یہ سراسر حق اور حکمت ہے، اس کے باوجود انہوں نے قرآنی آیات میں لفظوں کے انتخاب، جملوں کی ساخت، اسلوب بیان اور لفظوں کی تقدیم و تاخیر، تعریف و تنکیر، اطلاق و تقیید سے معانی میں ہونے والے تغیرات اور ان کے اثرات سے بحث کی ہے تو اس تعلق کی بنیاد پر جو ہر مسلمان کو قرآن حکیم سے ہے، اسی تعلق نے قرآن حکیم کے الفاظ، اصطلاحات، ترکیب کلام، اسلوب بیان، تاثیر اور نظم سے متعلق مباحث کو ایک وسیع و جامع علم کی حیثیت عطا کی ہے، اس علم سے قرآن حکیم کی حکمت کا علم ہوتا ہے، قرآنی الفاظ، اصطلاحات، تلمیحات اور آیات کا اپنی تخلیقات میں ڈھالنا بھی اسی والہانہ تعلق کی بنا پر ہے جو مسلمانوں کو قرآن حکیم سے ہے، انہوں نے قرآن حکیم کے ادبی و لسانی اعجاز پر بحث کی ہے یا آیات پر گرہ لگائی ہے تو محض اس لیے کہ اپنے کلام کو وقار و اعتبار عطا کر سکیں، ان کا مقصد قرآن کو شاعری ثابت کرنا نہیں بلکہ قرآنی آیات کی معجز بیانی کے مقابلے انسانی کلام کے عاجز ہونے کا اعتراف کرنا، اپنے کلام میں قرآن حکیم کے کسی لفظ، کسی اصطلاح یا کسی تلمیح یا کسی آیت کا استعمال کر کے اپنی بے مایہ زبان کو ادائے مطلب کی بلند ترین سطح پر پہنچانا اور قرآن حکیم سے اپنے قلبی اور ذہنی تعلق کا اظہار کرنا ہے، یہاں یہ نکتہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے کہ علمائے اسلام نے مختلف زاویوں اور جہتوں سے قرآن حکیم کے اعجاز کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کے الفاظ کو بھی معجزہ قرار دیا ہے اور معنی و بیان کو بھی، جامعیت، اختصار اور معنویت اس کے الفاظ، اصطلاحات اور اسلوب کا معجزہ ہے اور اصطلاحی معنوں میں بھی لغوی معنوں کا نظر انداز نہ کیا جانا معنی و بیان کا معجزہ، لہذا ایک تخلیق کار کو جب من حیث الکل قرآن کے معجزے کا ادراک ہوتا ہے تو وہ کلام اللہ کے جلال و جمال کی تاب نہ لا کر اسی کی آیت ورد زبان بنا لیتا ہے

فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ

یعنی "اس (قرآن) کے بعد کون سا کلام ہو سکتا ہے جس پر یہ ایمان لائیں"، تخلیق کار کا یہ عجز قرآن حکیم کے اعجاز کا منطقی نتیجہ ہے کیوں کہ اعجاز یا معجزہ کہتے ہی ہیں اس دلیل قطعی کو جو عاجز کر دینے والی ہو۔

اخبار علمیہ

خلا میں جہاں قبلہ کی صحیح سمت اور اوقات نماز پنج گانہ کا اندازہ نہیں ہو پاتا، وہاں ملیشیا اپنے خلائی ماہرین کو ایک روسی خلائی ادارے کے تعاون سے اس مقصد کے لیے بھیجنے کا ارادہ کررہا ہے، یہ خلاباز تحقیق کریں گے کہ خلائی سفر کے دوران پنج وقتہ نمازیں کیوں کر وقت معینہ پر ادا کی جائیں، چوں کہ خلائی جہاز ۲۸/ ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے صرف ۹۰/ منٹ میں زمین کے گرد ایک چکر مکمل کرتا ہے، ایسی صورت میں ادائیگی نماز کے لیے قبلہ رو ہونے اور پابندی اوقات کی شرط کا اہتمام مشکل ہے، یونی ورسٹی آف جارجیا میں مذاہب عالم کے استاد ایلین گوڈلاس نے اس سلسلہ میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ خلابازوں کے لیے اس اصول کے مطابق اوقات مقرر کیے جاسکتے ہیں جو قطب شمالی اور قطب جنوبی کے علاقوں میں ادائیگی نماز کے لیے مقرر ہیں اور چوں کہ خلائی سفر میں اعضاء انسانی پر پانی کا بہاؤ بھی ناممکن ہے، اس لیے وضو کے بغیر اس صورت میں تیمم سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

آئیزک نیوٹن کو دنیا عظیم ترین ماہر طبیعیات، جدید بصری علوم کے بانی اور نظریہ ارتقاء، نظریہ تجاذب ذرات واجسام اور انعکاس وانعطاف کے اولین منکشف کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن نیوٹن سے بہت پہلے ۹۶۵ء میں سرزمین عراق میں ابن الہیثم اس میدان میں اپنے تحقیقی نقوش چھوڑ چکے تھے، ان خیالات کا اظہار یونی ورسٹی آف سرے، برطانیہ سے وابستہ پروفیسر جم الخلیلی نے کیا ہے، پروفیسر جم قرون وسطی کے مسلمان سائنس دانوں کی زندگی پر بی بی سی کے ذریعہ کرائے جانے والے پروگرام کے ذمہ دار ہیں، اپنی تحقیق میں انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ نویں اور تیرھویں صدی کا درمیانی عہد عرب سائنس دانوں کا سنہرا دور تھا، جنہوں نے طب، فلکیات، کیمیا اور فلسفہ وغیرہ کے میدانوں میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے، ان میں سب سے روشن نام ابن الہیثم کا ہے، وہی تھے جنہوں نے پہلی بار روشنی، انعکاس اور انعطاف کے عمل

اور شعاعوں کے مشاہدے کے بعد دعوا کیا کہ زمین کی فضا کی بلندی سو کلو میٹر ہے اور افلاطون وغیرہ کے اس خیال کی تردید کی کہ آنکھ سے روشنی نکل کر اشیا پر پڑتی ہے، اپنے اس خیال کے اثبات کے لیے انہوں نے ریاضی کا سہارا بھی لیا تھا، اس تحقیق کی تیاری میں جم الخلیل نے بتایا کہ حال ہی میں فلکیات کے موضوع پر ابن الہیثم کا ایک رسالہ بھی دریافت ہوا ہے، جس میں اس نے سیاروں کے مدار کی وضاحت کی ہے، لہذا موجودہ سائنسی دنیا کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ابن الہیثم جدید سائنسی ضابطہ عمل کے بانی ہیں، یہاں یہ ذکر بھی مناسب ہے کہ علامہ شبلی نے ''مثنوی مولانا روم'' سے دسیوں ایسے اشعار اپنی کتاب ''سوانح مولانا روم'' میں نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقا اور نظریہ تجاذب ذرات کے انکشاف سے حکمائے اسلام بہت پہلے واقف ہو چکے تھے۔

یہودیوں کے ایک ربی موردافی الیاہو نے اپنے فتوی میں معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کے اجتماعی قتل کو اپنی مذہبی تعلیمات کے عین مطابق جائز ٹھہرایا ہے اور لکھا ہے کہ توریت میں باب پیدائش میں ہے کہ اپنے دشمنوں کو اجتماعی سزا دی جاسکتی ہے، اس لیے فلسطین میں اس قسم کی کارروائی کرنے والی یہودی ریاست کو مجرم نہ تصور کیا جائے، اس کے علاوہ ایک اور انتہا پسند ربی یسرائیل روزن نے بھی دشمن مردوں، عورتوں، بوڑھوں، بچوں حتی کہ بے زبان جانوروں کو بھی محرف توریت کے قانون کے مطابق صحیح بتایا ہے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ موردافی الیاہو کو اسرائیل میں مذہبی رجحان کے عوامی ترجمان کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔

اس سے قبل خبریں آئی تھیں کہ امریکی خلابازوں نے پہلی مرتبہ چاند پر کار چلائی اور گولف کھیلا لیکن اب یورپی خلائی ماہرین چاند پر پھول اگانے کا ارادہ کر رہے ہیں، یورپی خلائی ایجنسی سے وابستہ برنارڈ فوئنگ کا کہنا ہے کہ چاند پر ٹیولپ نامی پھول جو صرف یورپ میں ہوتا ہے چاند پر اگایا جاسکتا ہے کیوں کہ ٹیولپ کو اگنے کے لیے زمین سے غذائیت کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کی نشو و نما کے لیے ضروری اجزا اس کے بیج ہی میں موجود ہوتے ہیں اور یہ بہت مضبوط ہوتا ہے، انہوں نے یہ بھی کہا کہ ٹیولپ میں تکنیکی طور پر ایسی تبدیلیاں بھی کی جاسکتی ہیں جو اس کو

دیر تک باقی رکھنے کے لیے مددگار ثابت ہوں۔

آن لائن انٹریز کے ماہرین کے لیے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے اعلان کیا ہے کہ وہ انسائیکلو پیڈیا میں موجود مواد کو اپ ڈیٹ یا اس میں اضافہ کر سکتے ہیں لیکن یہ اضافہ اس اطلاع کے ساتھ شائع کیا جائے گا کہ یہ صارفین کا فراہم کردہ یا تدوین شدہ ہے، صارفین کے لیے اس عام اجازت کا مقصد صرف علمی و تحقیقی مواد کو مشترکہ کوشش سے محفوظ کرنا ہے، اس کے صدر کا کہنا ہے کہ اس سلسلہ میں ان ماہرین سے رابطہ کا ارادہ ہے جو پہلے سے ہی اس کے مواد کی تیاری میں خدمات انجام دے چکے ہیں، ان سے یہ درخواست بھی کی جائے گی کہ وہ اپنے مضامین میں تازگی لانے کے لیے اپنی ماہرانہ رائے سے واقف کرائیں، اسی کے ساتھ ساتھ معیار پر پورے اترنے والے ماہرین و صارفین کو تازہ ترین معلومات میں اضافہ کرنے کی دعوت بھی دی جائے گی۔

امان رحمان نامی بچے کا تعلق ہندوستان کے صوبہ اترا کھنڈ کے شہر دہرہ دون ہے ہے، اطلاع کہ ہے تین برس کی عمر سے اس نے کمپیوٹر کا استعمال شروع کر دیا تھا، ابھی اس نے اپنی عمر کی صرف آٹھ بہاریں ہی دیکھی ہیں لیکن کمپیوٹر اینیمیشن میں اس نے حیرت انگیز مہارت حاصل کر لی ہے اور پورا شہر اس کو ''ننھا بل گیٹس'' کے نام سے جانتا ہے، شروع میں جب اس کے والد کو اس کی اس صلاحیت کا علم ہوا تو دوستوں کے اصرار سے انہوں نے کمپیوٹر ماہرین سے ملاقات کرائی، جنہوں نے اس کے کام کو ناقابل التفات سمجھا اور کوئی توجہ نہیں کی مگر اس نے ہمت نہ ہاری، آخر کار دہرہ دون کالج آف ایٹریکٹیو آرٹس نے امان کو اپنے یہاں داخلہ دیا، امان نے پندرہ ماہ کے اینیمیشن کورس کو صرف تین ماہ میں ہی مکمل کر لیا اور اب وہ اسی کالج میں تدریسی فرائض انجام دے رہا ہے اور گنیز بک میں ''ینگ اچیورز'' کے شعبہ میں اپنا نام درج کرانے کا خواہاں ہے، اب تک اس نے ایک ہزار سے زائد اینیمیشن فلمیں بنائی ہیں۔

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

زاہدہ منزل، ۱۸۷۳/۴،
نیو فرینڈس کالونی، علی گڑھ۔
۲۷ جنوری ۲۰۰۹ء

محترمی۔ السلام علیکم

مولانا عبدالماجد دریابادی جن کا نام علم و ادب کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں، بساط شبلیؒ کے آخری حاشیہ نشین تھے جنھوں نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ مل کر دارالمصنفین (شبلی اکیڈمی) کی بنیاد ڈالی اور اس کی ترقی و کامیابی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے، وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے صدر اپنی وفات تک رہے اور اس کے ہر جلسہ و تقریب میں پابندی اور اہتمام سے شرکت کرتے تھے، اس کے علمی رسالہ ''معارف'' کی اشاعت، اس کے لیے شذرات و مضامین لکھنے کے سلسلہ میں ان کا بڑا نمایاں اور اہم حصہ رہا، ارکان و رفقائے دارالمصنفین حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولوی مسعود علی ندویؒ، مولوی عبدالسلام ندویؒ، شاہ معین الدینؒ، سید صباح الدین، مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ وغیرہ سے ان کے گہرے عزیزانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے، ان کی کئی کتابیں دارالمصنفین سے شائع ہوئیں، دارالمصنفین کے جشن طلائی کے موقع پر انہوں نے مولانا شبلیؒ پر ایک مفصل مقالہ سنایا جو حسن انشاء اور معنویت کا شاہکار ہے۔

اسے تاریخ کا المیہ کہنا چاہیے کہ ان کے دارالمصنفین سے اتنے قدیم تعلقات کو بالکل بھلا دیا گیا ہے اور بھولے سے بھی ان کا ذکر اس علمی ادارہ میں نہیں کیا جاتا، نہ ان کی کوئی کتاب وہاں دست یاب ہے، اس سے بڑھ کر تعجب و تاسف کی کیا بات ہوسکتی ہے، کیا ارباب دارالمصنفین اس فروگذاشت کی تلافی فرمائیں گے، مثلاً ان کی کچھ کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کر کے یا کسی مذاکرہ میں ان کا ذکر خیر کر کے۔

مرحوم کے کاغذات میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ۱۹۴۳ء میں لکھا ایک مکتوب نکلا جس سے ان حضرات کے تعلقات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اس کی نقل روانہ، مولانا دریابادیؒ ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ میگزین کے ''غالب نمبر'' کو پڑھ کر ایک خط جناب مختار الدین آرزو جو اس کے ایڈیٹر تھے بھیجا تھا، اس کی بھی نقل معارف میں اشاعت کے لیے روانہ ہے، نیز مولانا مرحوم کی دو غزلیں جو معارف میں شائع ہوئی تھیں کی نقل بھی۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ نے ایک خط راقم السطور کو بھیجا تھا جس میں ''حکیم الامت'' کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا تھا، اس کی نقل بھی بھیجتا ہوں۔

والسلام
مخلص ۔ عبدالعلیم قدوائی

وفیات

فضا ابن فیضی مرحوم

۱۷؍ جنوری کی شام لکھنؤ میں تھا کہ مئو سے ڈاکٹر شکیل اعظمی نے فضا ابن فیضی کے انتقال کی خبر دی، طبیعت ادہر عرصے سے ناساز ہی رہتی تھی، آخر بے قراری کو قرار آ ہی گیا اور ایک ایسا شاعر اس دنیا سے رخصت ہوگیا جس کی خوش کلامی اور خوش فکری عصائے دست غزل کا وقار رکھتی تھی۔

وہ خطہ اعظم گڈھ کی مردم خیز سرزمین مئو میں یکم جولائی ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے، گھرانہ علمی اور ذی عزت تھا، جدامجد مولانا محمد علی فیضی نامور عالم دین اور متعدد مذہبی کتابوں کے مصنف تھے، عربی، اردو اور فارسی میں یکساں قدرت کے ساتھ شعر کہتے تھے، دادا کی یہ میراث فضا کو بھی ملی اور انہوں نے تحدیث نعمت کے طور پر اور عربی رواج کے طرز پر والد کے بجائے دادا سے نسبت کو ترجیح دی، خالص عربی اور دینی تعلیم سے آراستہ فضا نے تجارت اور ملازمت کے ساتھ مشق سخن جاری رکھی، یہ محض طبیعت کا طرفہ تماشا نہ تھا، طبیعت میں خودداری اور احساس کی شدت نے دنیا اور زمانے کے درد و کرب کا حساب کرنا سکھایا، ان کی شاعری کی اٹھان اسی لیے غضب کی رہی کہ خارجی زندگی کے مظاہر پر ان کی نظر، حقیقت کے متنوع پہلوؤں کو سمیٹ لینے والی تھی، ان جیسے اور ان سے پہلے کے اور ہم وطن شاعر خلیل الرحمان اعظمی نے اسی خاصیت کو بیان بھی کر ڈالا۔

فضا کی زود گوئی مشہور ہے، سفینۂ زرگل، شعلہ نیم سوز، دریچہ سیم سمن، پس دیوار حرف، سبزۂ معنی بیگانہ اور حمد و نعت کا مجموعہ سرشاخ طوبی کے ہزاروں اشعار، اس شہرت کی تائید کرتے ہیں، ان کے علاوہ غزال مشک گزیدہ، لوح آشوب آگہی اور آئینہ نقش صدا کے نام بھی ملتے ہیں، زود گوئی کا لازمی نتیجہ رطب و یابس کا امتزاج ہے لیکن فضا کی شاعری میں فن کے خلوص، عصر کے شعور اور ذاتی تجربوں کے استادانہ اظہار نے یابس کا اندیشہ بھی نہیں ہونے دیا، انہوں نے اپنے پہلے مجموعہ کلام سے ناقدین کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ عصری ادب میں ان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، انہوں نے غزل، رباعی، نظم، ہر صنف میں طبع آزمائی کی، حمد و نعت کی سعادت بھی حاصل کی لیکن ان کی انفرادیت ہمیشہ ان کے ساتھ رہی، تخیل کی بلندی، الفاظ کی شوکت اور اس سے بڑھ کر فکر کی پاکیزگی اور اس سے زیادہ نئی نئی تراکیب کے کمال فن کا استعمال ان کو ہم عصروں میں فائق تر بناتا گیا، روایت کے خلاف بغاوت، پھر ترقی پسندی کے شور و شغف اور پھر اس کے

زوال اور اس کی جگہ دوسرے ادبی و شعری نظریات یہ سارے منظر فضا کے سامنے گزرتے رہے اور فضا روایتی اقدار کو سینے سے لگائے اپنے عصر کی زبان سے جدت اور تازگی سے معمور نغمے فضا میں بکھیرتے رہے

گردش رنگ معنی ہے وہی میرے لفظوں پہ گرانی ہے وہی

جس پہ قائم تھی حویلی اپنی وہی بنیاد کا پتھر غائب

فن عروج پاتا گیا لیکن ناقدری اپنی پستیوں میں چھپی رہی، کرب ذات کا اظہار ہونا ہی تھا

دیکھ کس کس زاویے سے امتحاں میرا ہوا اس ہنرمندی میں سب کچھ رائگاں میرا ہوا

بس یہی خاکستر جاں ہے یہاں اپنی شناخت ہوگیا سارا بدن جب راکھ تو چمکا ہنر

فضا کو حق تھا کہ سخن شناس ناقد ان کو فیض و فراق کی صف میں شامل کرتے، وہ یقیناً صف اول کے ان شعرا میں تھے جن کی شاعری کو ساحری کا درجہ حاصل تھا، جس کی ہر بات حرف دگر تھی، جس کی آواز، شہ رگ جاں کے ٹوٹنے کی آواز تھی اور جس کا لہجہ سلگتے بجھتے شرر کے مانند تھا، ان کو خود احساس تھا کہ ان کے طرز ادا میں جذب اور مناجات کا گداز ہے، وہ پیکر تراش فکر اور علامت نگار ذہن ہیں لیکن یہ احساس بھی ان کو ہمیشہ رہا کہ

بھرپور زندگی سے ہے لیکن مجھے وہ شخص خاموش اُجڑے اُجڑے کھنڈر کی طرح لگے

میر ناصر کاظمی اور خلیل الرحمان اعظمی کا سارا درد جیسے ان کی شاعری میں سما گیا اور اس کے اظہار میں انہوں نے ان سب سے الگ راہ نکالی، یہ غیر معمولی جرأت ان ہی کے بس کی تھی، کسی تحریک کے سائبان کے بغیر وہ نادر استعاروں، تازہ لفظوں اور پیکر تراشیوں کے فن کا مظاہرہ کرتے رہے اور یہ اس لیے ممکن ہوا کہ بقول خواجہ احمد فاروقی ان کو اپنے فن پر اعتماد تھا، ڈاکٹر محمد حسن نے ان کی غزل کو یہ کہہ کر داد دی کہ یہ صرف دل کا مرثیہ نہیں، دور حاضر کے درد و داغ و جستجو و آرزو کی پوری داستان سے عبارت ہے، فضا نے عصر حاضر میں غزل کی آبرو رکھی تو شمس الرحمان فاروقی کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوا کہ فضا غزل بہتر کہتے ہیں یا نظم، واقعی یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ دونوں فن کی کسوٹی پر یکساں کھرے ہیں۔

شعور و نظر کی طرح وہ عقیدہ و عمل کے پیکر رہے، ان کی نوا کے صنم، آزروں کے بس میں نہیں رہے، یہ وہ نعمت ہے جو ان کے قبیلے میں خال خال نظر آتی ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور اپنے قرب کی نعمت سے ہم کنار کرے۔ (آمین)

ع - ص

آثار علمیہ وتاریخیہ

اعظم گڈھ

محب مکرم و برادر عزیز زادکم اللہ قدراً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے تھانہ بھون ہو کے لکھنؤ پہنچنے کا علم ہو چکا تھا، اب آپ کا خط آیا، آپ نے بڑا کام کیا[۱]، اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرمائیں، خود میرے دل میں بھی یہ آتا تھا کہ میں غلام محمد صاحب سے کہوں گا تو شاید پانسو تک مان لیں مگر اپنی ناقدری اور کچھ عرض .... کنارہ گیری کی خواہش نے اس خیال کو ابھرنے نہیں دیا، بحمد اللہ کہ آپ نے ان کے کانوں تک تحریک پہنچا دیا، اب جو طریقہ آپ ان سے طے کریں اسی پر عمل کیا جائے، حیدر آباد کا سفر کرلوں گا مگر آپ ہیں نہیں تو ٹھہرنا کہاں ہوگا، میں بہرحال حاضر ہوں۔

مولوی مسعود علی صاحب میری کیوں سنیں گے، آپ براہ راست لکھیں شاید مان لیں، آج کل تو وہ محوِ عبادات ہیں یہ توفیق جس کو ملے، ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

ڈاکٹر ناظر یار جنگ ہی سے تاریخ مقرر کرائیے مگر اکتوبر کا آخری ہفتہ نہ ہو، میں بہاول پور میں پندرہ ہزار کی وصولی کی تحریک کر رہا تھا، اتفاق سے خود مجھے وہاں کے مدرسہ عربیہ جامعہ عباسیہ کی سند کے جلسہ میں یاد کیا گیا محض اس حسن اتفاق کی بنا پر جو اس بہانہ سے ہاتھ آ گیا ہے، میں وہاں آخری اکتوبر میں جانا منظور کر رہا ہوں، رام پور سے وعدہ تھا مگر ناامیدی ہوگئی۔

ذرا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کو کہیے کہ بہاول پور کا سرکاری مراسلہ جو پندرہ ہزار کی منظوری

---

[۱] حاشیہ من جانب مولانا عبدالماجد دریابادی، پہلے ایڈیشن میں رہ گیا، کام کیا تھا یاد نہیں پڑتا، غالباً اگست ۱۹۴۲ء کا ہے۔ (عبدالماجد دریاباد)

کا آیا تھا، دفتر میں تلاش کر کے رکھیں، وظائف کے لیے مدِ تبرّعات وصدقات سے ۶ ہزار ارامسال جب تک نہ ملیں مدرسہ چلنا مشکل ہے۔

میں ۶؍شوال تک حاضری کا قصد رکھتا ہوں۔

والسلام

سید سلیمان

۱۴؍رمضان المبارک ۱۳۶۲ھ؍ ۱۹۴۳ء

آرزو صاحب!

آپ کے ذوق ادب کا قائل تو میں میگزین کا پچھلا نمبر پڑھ کر ہو ہی چکا تھا، آپ کی جرأت کا قائل اب ہونا پڑ رہا ہے کہ آپ اس ترقی اور ''ترقی پسندی'' کے دور میں غالب مرحوم کا نام زندہ کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں

کہ اکثر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

آپ کو یاران طریقت کی اس پھبتی کا رڈ نہیں کہ یہ گڑے مردے اکھیڑنا نہیں تو اور کیا ہے! غالب بیچارہ حمد ونعت کہنے والا توحید وتصوف کے مسلک کو سو سو طرح پر نظم کرنے والا، قدیم عاشقانہ غزل گوئی کا دم بھرنے والا ''بورژوا'' سوسائٹی کا شاعر، وزن وقافیہ کی پابندیوں میں جکڑا ہوا، عریانی وفحاشی کے آرٹ سے نا آشنا، صنعت بے بحری سے بے بہرہ، رکاکت وابتذال سے محروم، اس قابل ہی کب تھا کہ آج کوئی اس کے نام کو جگائے اور اس کے حق میں فاتحہ خیر کو ہاتھ اٹھائے!

حضرت غالب کا مرتبہ فارسی شاعری میں بھی یقیناً بہت بلند ہے لیکن مجھ بے بصر، تنگ نظر کے علم میں تو اردو میں جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے کوئی شاعر اس پایہ کا نہ غالب کے قبل پیدا ہوا تھا نہ غالب کے بعد آج تک ہوا ہے، گو اس میں شبہ نہیں کہ بعض بعض متاخرین نے اپنے اندر غالبیت خوب خوب پیدا کر لی ہے اور یہ کم سواد وبے استعداد حضرت غالب کی شاعری ہی کی طرح ان کی اردو نثر کا بھی دلدادہ بلکہ فتیل ہے، خصوصاً جب سے کہ ان کے خطوط کا مجموعہ مرتبہ مولوی مہیش پرشاد بنارسی نظر سے گزرا ہے، البتہ عبدیت سطر سطر سے نمایاں ہے، غالب اس آئینہ

میں ایک مکمل انسان، ایک عبد خالص نظر آتے ہیں اور اسی حقیقت کی جلوہ آرائی، انشا پردازی کا منتہائے کمال ہے۔

عبدالماجد دریابادی
ستمبر ۱۹۴۹ء

نوٹ: (یہ خط مولانا مرحوم نے مختار الدین احمد صاحب آرزو کے نام بھیجا تھا جب وہ مسلم یونی ورسٹی کے طالب علم تھے اور علی گڑھ "میگزین" کے ایڈیٹر بھی، ان کے مرتبہ میگزین کے غالب نمبر کو پڑھ کر انہوں نے داد کا یہ خط بھیجا جو حسن انشا کا نمونہ ہے، آرزو صاحب مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ عربی کے پروفیسر ہو کر ریٹائرڈ ہوئے اور آج کے مانے ہوئے ممتاز محقق ہیں۔)

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

ماہنامہ محدث عصر: خصوصی گوشہ، بانی رسالہ مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری، مدیر مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری، صفحات:۱۰۸، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت فی شمارہ:۱۰ روپے، سالانہ:۱۰۰ روپے، پتہ: شعبہ نشرو اشاعت، جامعۃ الامام محمد انور شاہ کشمیری، دیوبند۔

مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری ممتاز محدث، مشہور عالم اور گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے، وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، انہوں نے اپنا الگ رنگ اور جداگانہ آہنگ قائم کیا تھا، وہ زبردست خطیب، صاحب اسلوب ادیب اور ملک کے نامور سیاسی قائد بھی تھے، اتنے متنوع امتیازات کی حامل شخصیت کی رحلت یقیناً ایک جانکاہ حادثہ سے کم نہیں۔

مولانا سید انظر شاہ ۱۴ر شعبان ۱۳۴۷ھ/۲۶ر جنوری ۱۹۲۹ء کو دیوبند کے ایک علمی خانوادہ میں پیدا ہوئے، پانچ برس کی عمر کو پہنچے کہ والد بزرگوار علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی وفات ہوگئی، ختم کلام پاک اور فارسی کا پانچ سالہ کورس دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۴۲ء میں مکمل کیا، مزید تعلیم کے لیے دیوبند کے علاوہ دہلی اور لاہور کی خاک نوردی کی، ابتدائی تعلیم علامہ شبیر احمد عثمانی کی زیر سرپرستی ہوئی، ان کے خالہ زاد بھائی حکیم اختر نے انگریزی تعلیم کے لیے پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں داخل کیا، تقسیم ہند کے بعد بگڑے حالات کے باعث دیوبند لوٹ آئے اور والد محترم کے شاگرد خاص مولانا اصغر علی سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور دارالعلوم دیوبند میں سال پنجم میں داخلہ لے کر بہت کم مدت میں سند فضیلت حاصل کی، اس کے علاوہ یہیں سے مولانا

حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی اور علامہ ابراہیم بلیاوی وغیرہ سے خصوصی سند حدیث حاصل کر کے مادر درس گاہ میں ہی درس وتدریس سے منسلک ہوگئے۔

مولانا موصوف اپنی گوناگوں خداداد صلاحیتوں کی بدولت دارالعلوم کے ناظم دارالاقامہ، معاون مجلس تعلیمی، ناظم مجلس تعلیمی، قائم مقام مہتمم اور تقریباً چار برس تک شیخ الحدیث کے بلند اور پروقار عہدوں پر فائز رہے، جشن صد سالہ میں کلیدی ذمہ داری نبھائی، تقسیم دارالعلوم کے بعد خانوادۂ قاسمی کے ساتھ مل کر دارالعلوم وقف کی بنیاد رکھی اور اس کی تعمیر وترقی کے لیے دل وجان سے جد وجہد کی اور اسے تعلیمی لحاظ سے عروج بخشا، تادم واپسیں وہ اس میں صدر مدرس، معتمد تعلیمات اور شیخ الحدیث رہے۔

وہ تقریر وخطابت کے ساتھ ساتھ تحریر وانشاء پردازی میں بھی یکتائے روزگار تھے، زیرنظر رسالہ "محدث عصر" کے وہ بانی تھے جو ان کی تحریروں کی جولانی وجاذبیت، انشاپردازی اور فصاحت وبلاغت کا بین ثبوت ہے، ان کے قلم کے جلوے صرف ہندوپاک کے رسائل میں ہی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کے رسائل وجرائد میں بکھرے ہوئے ہیں، جو علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، معاشی جیسے مختلف اور متنوع موضوعات پر محیط ہیں، انہوں نے تقریباً ڈیڑھ درجن مستقل تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں جن میں بیشتر علم حدیث کے موضوع پر ہیں۔

مولانا موصوف جامع کمالات تھے، وہ بلند مقام عالم دین، محدث جلیل، شعلہ بیان مقرر، اچھے صحافی اور بہترین مصنف ومترجم تھے تو دوسری جانب وہ سیاسی اور سماجی زندگی میں بھی مثالی تھے، وہ ملک وبیرون ملک میں ہونے والے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی جلسوں اور کانفرنسوں میں بحیثیت مقرر مدعو کیے جاتے تھے، وہ اصلاح نصاب کے حامی تھے، تمام تر مخالفتوں کے باوجود انہوں نے مدرسہ بورڈ کے قیام کی حمایت کی اور مثبت دلائل کے ذریعہ اہل علم اور دانش وران قوم وملت کو اس کی ضرورت کا احساس دلایا۔

محدث عصر کے اس خصوصی شمارہ میں مولانا موصوف کی شخصیت اور خدمات کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے، یہ جامعۃ الامام محمد انور شاہ کا علمی، ادبی اور اصلاحی ترجمان ہے، رسالہ اور ادارہ دونوں ہی ان کے پروردہ ہیں اور ان دونوں سے موصوف کا گہرا اور دیرینہ تعلق تھا، اس

مجموعہ میں تقریباً ڈیڑھ درجن مضامین ہیں جن میں مولانا کی حیات وخدمات خاص طور سے علمی کارناموں اور سیاسی وسماجی اور مذہبی خدمات پر مختصراً اظہار خیال کیا گیا ہے، ان موضوعات کا تفصیلی مطالعہ خصوصی شمارہ جامعۃ الامام محمد انور شاہ دیوبند کے زیر اہتمام مارچ ۲۰۰۹ء میں مولانا موصوف پر منعقد ہونے والے دوروزہ عالمی سمینار کے موقع پر شائع ہوگا۔

سہ ماہی فکرونظر (برصغیر میں مطالعہ حدیث نمبر): مدیر ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمان، صفحات: ۴۷۲، کاغذ وطباعت عمدہ، قیمت فی شمارہ: ۶۰ روپے، زرسالانہ: ۲۰۰ روپے، پتہ: شعبہ مطبوعات، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد نے اپنی قریب نصف صدی کی زندگی میں بہت سی علمی خدمات انجام دی ہیں، اس نے اعلا علمی وتحقیقی معیار کی متعدد کتب وجرائد شائع کی ہیں، علما و محققین کے مقالات وخطبات کے ذریعہ علوم وفنون اور فکر ونظر کی آبیاری کی ہے، اب تک اس نے اہم موضوعات پر کئی کامیاب سمینار کا انعقاد کیا ہے جن میں طبی وفقہی مسائل اور برصغیر میں مطالعہ قرآن جیسے موضوعات شامل ہیں۔

قرآن کریم کے بعد شریعت اسلامیہ میں حدیث کو مصدر وماخذ کا درجہ حاصل ہے، اسی وجہ سے جہاں ایک طرف دشمنان دین نے ذخیرہ احادیث کے بارہ میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی وہیں علما ومحدثین نے اس کی حفاظت کے سلسلہ میں جو بے مثال کارنامہ انجام دیا ہے اس کی کوئی مثال تاریخ میں نہیں ہے، اس موضوع پر برصغیر ہندو پاک کے مختلف مکاتب فکر کے اہل علم نے بھی قابل رشک خدمات انجام دی ہیں، برصغیر کے محدثین کرام کی خدمات کا جائزہ لینے اور ان کی کوششوں کو اجاگر کرنے کے لیے ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کے شعبہ حدیث کے زیر اہتمام ۲۰۰۳ء میں ”برصغیر میں مطالعہ حدیث“ کے موضوع پر دوروزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا، اس میں اندرون ملک کے ۵۲ر مندوبین نے مقالے پڑھے جو سمینار کی کامیابی کا واضح ثبوت ہے، موضوع کی اہمیت کے مدنظر ان میں سے ۱۳ر منتخب مقالوں کو فکرونظر کے ایک خاص نمبر کی حیثیت سے شائع کیا ہے۔

یہ مجموعہ تین حصوں میں منقسم ہے، باب اول میں برصغیر میں علم حدیث سے متعلق مقالات ہیں، اس حصہ میں کل چھ مقالے ہیں، سب سے اول مقالہ محترمہ محسنہ عظیم کا ''برصغیر میں علم حدیث کا آغاز'' کے موضوع پر ہے، انہوں نے برصغیر ہند و پاک میں اسلام کی ضیاء پاشی کب ہوئی، یہاں علم حدیث کا آغاز کب ہوا، برصغیر ہند و پاک میں تشریف لانے والے کون کون سے صحابہ کرامؓ تھے وغیرہ پر گفتگو کی ہے، برصغیر میں اشاعت حدیث کی ابتدا دوسری صدی ہجری سے بتاتے ہوئے اس سلسلہ میں قاضی اطہر مبارک پوری کی تصنیف ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' کا حوالہ دیا ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے اشاعت حدیث کے تین ادوار کا ذکر کیا ہے، برصغیر میں علم حدیث کا پہلا مرکز چوتھی صدی ہجری میں کراچی سے قریب دیبل کی بندرگاہ میں قائم ہوا، برصغیر میں علم حدیث کے آغاز کا دور چوتھی صدی ہجری تک محیط ہے، سیاسی عدم استحکام کے باوجود اسی دور کے محدثین کرام کی غیر معمولی جدوجہد کے نتیجہ میں یہاں علم حدیث کی اشاعت کا کام اس قدر پھیلا کہ اس سے ایک عالم مستفید ہوا، دوسرا مضمون تاج الدین ازہری کا ''اصول حدیث میں علمائے برصغیر کی خدمات'' ہے، فاضل مقالہ نگار نے اصول حدیث کے موضوع پر کام کرنے والے تقریباً تین درجن علما و محدثین کی خدمات اور ان کی تصانیف کا بہت اچھا جائزہ پیش کیا ہے، ساتھ ہی دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل کی جانے والی کتابوں کا بھی جائزہ پیش کیا ہے، ڈاکٹر محمد طفیل نے ''موضوع احادیث اور محدثین برصغیر'' کو اپنا موضوع بنایا ہے، انہوں نے موضوع احادیث کی حقیقت کی پہچان اور اس سے امت مسلمہ کن امور میں فائدہ اٹھا سکتی ہے، جیسے امور کی نشان دہی کرتے ہوئے اس موضوع پر لکھی جانے والی ڈیڑھ درجن تصانیف کا جائزہ لیا ہے، اس کے علاوہ برصغیر میں اس موضوع پر ہونے والی پیش رفت کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، ان مقالوں کے علاوہ اس باب میں ''برصغیر میں شمائل نبی پر لکھی جانے والی کتب'' (منیر احمد)، ''المجالس العلمی، برصغیر میں خدمت و اشاعت حدیث'' (پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد) اور ''بریلوی علما اور خدمت حدیث، ایک جائزہ'' (ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس) کے وقیع مقالے شامل ہیں۔

باب دوم میں برصغیر کی معروف شخصیات اور خدمت حدیث کے موضوع پر سات

مقالے شامل ہیں، پہلا مقالہ ''مولانا اشرف علی تھانوی اور احادیث تصوف کی تدوین و تحقیق'' (پروفیسر ڈاکٹر سید ازکیا ہاشمی)، ۲- ''فکر فراہی اور خدمت حدیث'' (محمد خالد مسعود)، ۳- ''باب الاسلام سندھ کے معروف محدثین'' (محمد رمضان مہیری)، ۴- ''علامہ محمد طاہر پٹنی اور ان کی کتاب مجمع بحار الانوار: ایک علمی و تحقیقی جائزہ'' (ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی)، ۵- ''علامہ شبیر احمد عثمانی کی خدمات حدیث'' (ڈاکٹر محمد اشرف شاہین قیصرانی)، ۶- ''نواب صدیق حسن خاں کی خدمات حدیث'' (ڈاکٹر حمید اللہ عبدالقادر)، ۷- اور ''محمد اسد بطور ترجمان و شارح حدیث: عمومی جائزہ'' (محمد ارشد)، مقالات پر مغز اور معلومات افزا ہیں۔

رسالہ کا تیسرا گوشہ تعارف و تبصرہ کتب پر مشتمل ہے، مجموعی طور پر رسالہ کے تمام مقالے مفید، قابل قدر اور اپنے موضوعات کا پوری طرح احاطہ کرتے ہیں، ادارہ اور مدیر دونوں ہی قابل مبارک باد ہیں۔

ماہنامہ راہ اعتدال (خصوصی شمارہ، موانع ترقی امت): مدیر حبیب الرحمان اعظمی عمری، صفحات: ۲۳۲، کاغذ و طباعت عمدہ، قیمت فی شمارہ: ۱۰ روپے، سالانہ: ۱۰۰ روپے، (خصوصی شمارہ: ۴۰ روپے)، پتہ: منیجر راہ اعتدال جمعیت ابنائے قدیم، جامعہ دارالسلام عمرآباد، ۶۳۵۸۰۸، جنوبی ہند۔

جامعہ دارالسلام عمرآباد جنوبی ہند کی مشہور اور قدیم دینی درس گاہ ہے، زیر نظر رسالہ اس کی جمعیت ابنائے قدیم کا دینی، دعوتی اور اصلاحی ترجمان ہے، اس سے قبل اس کا دہشت گردی نمبر شائع ہوا تھا، اب دور حاضر کی اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یہ خصوصی شمارہ شائع کیا گیا ہے اور اس میں ان موانع سے بحث کی گئی ہے جو ترقی امت کی راہ میں حائل ہیں، ہر قوم کی ترقی میں تعلیم اور اساتذہ مرکزی کردار ادا کرتے ہیں جو قوم تعلیم و تعلم میں محنت و مشقت اور پورے لگن کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے اس کے لیے ہر طرح کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے راستے خود بخود ہموار ہوتے چلے جاتے ہیں اور ترقی کی منزلیں ان کا استقبال کرتی ہیں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کو باصلاحیت، فرض شناس، مخلص، باکردار اور مقصد کا شعور رکھنے والے اساتذہ حاصل ہوں، مسلمانوں کے پاس آج دینی اور عصری دونوں طرح کی درس گاہوں

کی کمی نہیں، اگر کمی ہے تو بااصول باصلاحیت محنتی اور بے غرض اساتذہ کی۔

بدقسمتی سے آج کا دور مادہ پرستی اور خودغرضی کا دور ہے جہاں اخلاق وروحانیت اور ایثاروقربانی وغیرہ کا یکسر فقدان ہے، ہمارے دینی مدارس اور عصری تعلیم دینے والی درس گاہوں میں اساتذہ زیادہ سے زیادہ مقررہ نصاب تعلیم کو ہی مکمل کردینے کو اپنا فرض تصور کرتے ہیں، ان کی نظر میں طلبہ کی ذہنی وعلمی اور اخلاقی تربیت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، ان حالات میں یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ فرض شناس اساتذہ کی تلاش کی جائے جو طلبہ کی کردار سازی، ان کی ذہنی و عملی تربیت کرنے اور ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے اور نکھارنے کا جذبہ رکھتے ہوں اور ان کو معاشرے کے سچے خادم، قوم کے مخلص رہنما اور مستقبل کے علم و ہنر کے روشن سورج بنانے کے حوصلہ اور جذبہ سے سرشار ہوں۔

یہ مجموعہ تین درجن سے زائد مضامین پر مشتمل ہے، آغاز کلام افادات مولانا حافظ عبدالکبیر عمیری سے کیا گیا ہے جس کی ابتدا آیت قرآنی ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ '' سے ہے، پیغامات مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا محمد سالم قاسمی اور مولانا سید جلال الدین عمری کے ہیں، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب فرماتے ہیں ''بہت اچھا ہے کہ ان کمزوریوں کو سمجھا جائے اور ان کی شناخت کی جائے، تاکہ امت کی ترقی کے موانع دور کرنے میں ان سے مدد ملے، اس لحاظ سے اس موضوع پر خصوصی نمبر کا نکالنا ان شاء اللہ مفید ثابت ہوگا''۔

پہلا مقالہ ''صحت عقیدہ مسلمانوں کے عروج کا بنیادی سبب'' کے عنوان سے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے قلم سے ہے، جناب سید حامد نے ''زوال امت کا سبب'' کو اپنا موضوع بنایا ہے، وہ لکھتے ہیں ''اس کے بہت سے اسباب ہیں، ان میں اتحاد نہیں، وہ ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں، ان میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی چھڑ جاتی ہے، ان میں ادارے چلانے کی صلاحیت باقی نہیں ہے، تنظیم سے انہیں کوئی سروکار نہیں''، انہوں نے زوال امت کی ذمہ داری متعدد سماجی برائیوں اور کمیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، مولانا وحید الدین خاں نے ''تعمیر ملت''، مولانا ابوسعود اظہر ندوی نے ''ملی امراض اور ان کا علاج''، مولانا حفیظ الرحمان اعظمی عمری

نے ''قیادت کا فقدان''، ڈاکٹر شکیل احمد نے ''ہمہ جہت تعلیمی پیش رفت''، مولانا ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے ''قرآن سے غفلت''، مولانا محمد منیر الدین عمری نے ''تعلیم نسواں سے غفلت'' کو اپنا موضوع بنایا ہے، مولانا محمد یوسف اصلاحی نے ''زوال امت کے دو اہم اسباب'' پر روشنی ڈالی ہے، ان کے علاوہ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، مولانا محمد جرجیس کریمی، جناب عزیز بلگامی، محترمہ عظمی ناہید، مفتی فضیل الرحمان ہلالی عثمانی، مولانا محمد ثناء اللہ، مولانا عبد العظیم عمری، ڈاکٹر تابش مہدی، مولانا اسرار الحق قاسمی اور ڈاکٹر سعید احمد بن عبد اللہ عمری نے بھی موضوع کا بھرپور احاطہ کرتے ہوئے موانع ترقی امت کے اسباب اور ان کا حل تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

الاصلاح: مدیر فرید الدین فہیم الدین، صفحات: ۶۴، کاغذ و طباعت عمدہ، قیمت درج نہیں، پتہ: شعبہ نشر و اشاعت، جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڈھ۔

مدرسہ جامعہ اسلامیہ، اعظم گڈھ کا نسبتاً جدید تعلیمی ادارہ ہے لیکن محنت و معیار کے لحاظ سے اس نے بہت جلد ملک گیر شہرت حاصل کرلی ہے، مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری کی سرپرستی میں یہ ادارہ روز افزوں ہے، تعلیم کے ساتھ طلبہ کے اندر خطابت و کتابت کا زیادہ سے زیادہ ذوق وشوق پیدا کرنے اور عصر حاضر کے مطابق شستہ اور شگفتہ زبان پر قدرت حاصل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے، زیر نظر رسالہ اسی تربیت کا آئینہ ہے جس میں متعدد موضوعات پر ڈیڑھ درجن سے زائد مضامین ہیں اور یہ سب معیاری ہیں جو طلبہ کی علمی تربیت اور روشن مستقبل کی نشان دہی کرتے ہیں۔

ع - ا

مطبوعات جدیدہ

اٹھارہویں صدی عیسوی میں برصغیر میں اسلامی فکر کے رہنما | مرتب جناب محمد خالد مسعود، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۴۶۵، قیمت: ۴۰۰ روپے، پتہ: ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، پاکستان۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کا افق مسلمانوں کے زوال سے سیاہ ہو چلا تھا لیکن اسی آسمان پر قدرت نے ایسے ستارے بھی روشن کردیے جن سے ظلمتوں کے چھٹ جانے کی بشارت بھی ظاہر ہورہی تھی، یہ شخصیتیں یقیناً اپنے اپنے دائرہ کار میں انقلابی تھیں اور عہد ساز بھی، شاہ ولی اللہ اوران کے خانوادے کے شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع الدین، مرزا عبدالقادر بیدل، میرزا مظہر جان جاناں، شاہ عبداللطیف بھٹائی، غلام علی آزاد بلگرامی، قاضی محمد اعلیٰ تھانوی، میر درد، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور مرزا ابوطالب، یہ سب ایک نئے دور کی آمد کے حوصلہ مند نقیب تھے، اس مجموعہ مضامین میں گیارہ شخصیتوں کا ذکر گویا احد عشر کوکبا کی تفسیر ہے، ان حضرات کے وجود نے واقعی یہ سوال قائم کیا کہ زوال پذیر مسلم حکومت اور سیاسی حالات کا اثر اسلامی فکر و ثقافت پر بھی اسی درجہ کا تھا؟ یا علما و مفکرین کے نظریات واقعی مایوسی کے عالم میں بھی اتنے رجائی تھے کہ بعد کی انیسویں اور بیسویں صدی میں گم شدہ سیاسی قوت کی بازیابی اور اس سے بھی زیادہ دین کے احیا و تجدید کا یہ پیش خیمہ ثابت ہوئے؟ اس سوال کی اہمیت نے ادارۂ تحقیقات اسلامی کو آمادہ کیا کہ وہ جواب کی تلاش میں مسلسل مذاکرے کا اہتمام کرے، چنانچہ یہ مذاکرہ ہوا اور وقفے وقفے سے دو سال تک ہوتا رہا، پاکستان کے ممتاز اہل علم و دانش جیسے رحیم بخش شاہین، قدرت اللہ فاطمی، محمد اسحاق قریشی، عطش درانی، محمد صدیق شبلی، ایم ایس ناز، سید از کیا ہاشمی اور خود اس مجموعہ کے فاضل مرتب نے مقالے پیش کیے اور کوئی شک نہیں کہ اٹھارہویں صدی کے انحطاط کی نوعیت، ریاست اور معاشرے اور ہندو مسلم ربط و ارتباط کے بعض اہم عقدوں کی گرہ کشائی، ان مقالات سے ہوتی ہے، فاضل

مرتب کا مفصل مقدمہ بھی خوب ہے، جس سے اٹھارویں صدی کے اسلامی ہند کی تصویر واضح اور کامل طریقے سے سامنے آجاتی ہے، مضامین میں تنوع اور خیالات میں انفرادیت ظاہر ہے ناگزیر ہے، شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ذکر میں سید قدرت اللہ فاطمی کا پہلا جملہ ہی اظہار رائے کی دعوت دیتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کی بے مقصد جنگوں نے برصغیر میں قائم سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کو توڑ پھوڑ دیا تھا، اسی مضمون کے اور بھی مقامات محل نظر ہیں، تاہم شاہ بھٹائی کے مطالعہ کے لیے اس کی اہمیت کم نہیں، دوسرے مضامین بھی تجزیاتی اور استقرائی اسلوب اور مواد کی کثرت کی وجہ سے عام قارئین کے ساتھ تاریخ ہند کے طلبہ و محققین کے لیے بھی مفید اور پراز معلومات ہیں۔

تواریخ بنگالہ: از ابوالمعالی محمد عبدالروف وحید بنگالی، مترجم جناب نشور واحدی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۸۴، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: نیاز واحدی، ۴۰۸/۳، نیو حیدر آباد، لکھنؤ۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں سلطان ٹیپو شہید کے حفید شاہزادہ محمد کیقباد نے زیر نظر کتاب کے مولف وحید بنگالی سے فرمائش کی کہ وہ بنگال کی تاریخ مرتب کریں، وجہ بھی تھی کہ وحید مرحوم کا خاندان کئی پشتوں سے بنگال کے خطہ کو جنت البلاد سمجھ کر اسی کا ہو رہا تھا، کلکتہ کے معمورۂ نزہت آباد کے الفاظ خود مولف کی محبت کے آئینہ دار ہیں، انہوں نے بعض انگریزی تاریخوں کی مدد سے فارسی میں قدیم عہد سے علی وردی خاں تک سرگزشت بنگال مرتب کردی، قدیم تاریخ مختصر ہے، اصل تاریخ مسلمانوں کے دور حکومت پر مشتمل ہے، یہ کتاب ۱۸۷۷ء میں مکمل تھی لیکن تعجب ہے کہ یہ اب تک شائع نہ ہوسکی، نشور واحدی مرحوم کو یہ مخطوطہ ملا تو انہوں نے اس کو اردو قالب میں منتقل کردیا، یہ ترجمہ بھی نصف صدی تک غیر مطبوع رہا، شکر ہے کہ ان کے سعید صاحبزادے نیاز واحدی کی کوششوں سے یہ مطبوعہ شکل میں اب ہمارے سامنے ہے، بنگال کی تاریخ کے ساتھ اس کتاب سے نشور واحدی کے کامیاب مترجم ہونے کی واقفیت بھی ملتی ہے، نشور صاحب کی اصل شہرت کا سبب ان کی شاعری ہے لیکن ان کی نثر بھی ان کی شاعری کی طرح دل کش اور جاذب نظر تھی، دانش آخرالزماں، تاریخ فلسفہ خودی، ہندوستان میں فلسفہ خودی کا ارتقا، یہ تینوں کتابیں ان کی نثر نگاری کی خوبیوں کی مثال ہیں، اب زیر نظر کتاب سے ان کی ترجمہ نگاری

کی خوبی بھی ظاہر ہوئی، کتاب میں نشور واحدی کی شخصیت اور نثر ترجمہ نگاری پر ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر محمد ارشد خاں اور نشور صاحب کے فرزند نیاز واحدی کی تحریریں بھی ہیں۔

کاروان رفتگاں: از مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم، مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۷۲، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: ندوۃ التالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ۔

مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم کا شمار ندوہ اور دارالمصنفین یعنی دبستان شبلی کے ان اہل قلم میں ہوتا ہے جن کی ہر تحریر، مطالعہ و فکر اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ اسلوب کی لطافت سے آراستہ رہتی ہے، ان کی جولانی طبع اور ہمہ وقت رواں اور متحرک بلند ہمتی نے تعلیم، سیاست، اصلاح معاشرہ کے لیے وقف کر رکھا تھا لیکن قلم سے ان کا رشتہ کبھی کمزور نہیں ہوا، ان کا رسالہ ''الرشاد'' ان کی تحریروں سے باوقار اور ذی اعتبار رہا، اس میں ایک کالم وفیاتی تعزیتی تحریر کے لیے بھی خاص تھا، مولانا مرحوم کا میدان عمل جتنا وسیع اور گویا ہمہ گیر تھا، شخصیات سے ربط و تعلق بھی اسی درجہ کا تھا، خاندان کے بزرگوں، اساتذہ، احباب اور تلامذہ، زندگی کے سفر میں ساتھ چھوڑتے گئے اور مولانا مرحوم ان کی یادوں کو قلم کے سپرد کرتے گئے، یہ صرف یادیں ہی نہیں ان کے عہد کی تاریخ کی جھلکیاں بھی ہیں، رسالہ الرشاد میں ان بکھری تحریروں کو لائق مرتب نے خوب کیا جو سلیقے سے یکجا کر دیا، مولانا شبلی فقیہ سے مولانا اسعد مدنی تک قریب ایک سو بیس شخصیتوں کے احوال، صرف نام نیک کو فراموشی سے بچاتے ہی نہیں موجودہ اور آیندہ نسل کو ان چراغوں سے کسب نور کا پیغام بھی دیتے ہیں، لائق مرتب کے دیباچے اور ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی کا پیش لفظ بجائے خود نثری شہ پارے ہیں جو نہایت موثر اور دل کش اسلوب میں مولانا مجیب اللہ ندوی کی شخصیت سے اور قریب کر دیتے ہیں۔

تعلیمات قرآن: از جناب مولانا اشہد رفیق ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۰۴، قیمت: ۱۶۰ روپے، پتہ: اریب پبلی کیشنز، ۱۵۴۲، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔

توحید، ملائکہ، انبیاء و رسل، کتب آسمانی، آخرت، قیامت، جنت دوزخ اور اسلام کے

ارکان، عبادات، اخلاقی تعلیمات یعنی قرآن مجید کی تمام تعلیمات کا عطر، نہایت آسان زبان میں پیش کرنے کے علاوہ اس میں عقل و ذہن کے سوالوں اور مطالبات کی تشفی کا جس طرح خیال رکھا گیا ہے، اس کی وجہ سے اپنے موضوع پر یہ کتاب دوسروں سے جدا اور نمایاں بن گئی ہے، وجہ بھی ہے کہ شکاگو کی ایک تعلیمی انجمن اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے بانی اور واقعی مرد غازی ڈاکٹر عابد اللہ نے مغرب بلکہ پوری دنیا پر مسلط مغربی ماحول میں پلنے والی موجودہ مسلمان نسل کی رہنمائی اور تربیت کے اور نصابی ضرورت کے لیے ایک جامع اور اپنے موضوع پر محیط کتاب کی خواہش کی اور اس خواہش کی کماحقہ تکمیل کی سعادت اس کتاب کے نوجوان اور لائق مصنف کو حاصل ہوئی، ڈاکٹر غازی اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی تحریروں نے اس کتاب کی اہمیت اور بیان کردی۔

خواتین کے شرعی مسائل: از مولوی منور سلطان ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوب صورت گرد پوش، صفحات ۵۵۲، قیمت: درج نہیں، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلما لکھنؤ اور دہلی، حیدرآباد اور بھٹکل کے مختلف مکتبے۔

بہشتی زیور کے بعد اگرچہ کچھ کتابیں خواتین کے شرعی مسائل کے متعلق لکھی گئیں، ان کی افادیت کے باوجود یہ بھی سچائی ہے کہ وہ مسائل کی ساری صورتوں اور نوعیتوں کے لحاظ سے ناکافی تھیں، بہشتی زیور نے عرصہ تک یہ ضرورت پوری کی لیکن وقت کے ساتھ نئے مسائل اور اس سے بھی زیادہ عام مسائل کی تفہیم کی ضرورت محسوس کی جانے لگی، عام طور سے نکاح و طلاق اور پاکی اور ناپاکی کی عام باتوں کو دہرایا جاتا رہا، ساتھ ہی کسی جامع اور مفید تر کتاب کا انتظار بھی رہا، زیر نظر کتاب کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وقت اسی کا منتظر تھا جس میں وضو، غسل، حیض و نفاس، نماز، جماعت، امامت، جنازہ اور روزہ، زکوۃ، اعتکاف، صدقہ فطر، حج، نکاح، رضاعت، طلاق، عدت، نسب، پرورش، نفقہ، امور فطرت، لباس پوشاک، زوجین کے تعلقات، پردہ، زیب و زینت، علاج معالجہ، میراث کے عنوانوں کے تحت شاید ہی کوئی جزئیہ ہو جس کا ذکر نہ ہو، اجنبی ڈاکٹر سے علاج، جسمانی عیوب کا علاج، ولادت کے لیے آپریشن، موٹے بدن کو سڈول بنانا، عورت کا ڈرائیونگ کرنا، کھیل کود اور ورزش، ملازمت، سیاست، مفتی قاضی بننا جیسے مسائل پر بھی صحیح رہنمائی

موجود ہے، سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف کی نظر اصل مصادر ومراجع پر رہی، ہر مسئلے کے ساتھ مخصوص قطعیہ کے دلائل میں چاروں ائمہ کی رائیں بھی ہیں گو اصل مسائل ہندوستان کی رعایت سے حنفی فقہ کی روشنی میں ہیں، طہارت اور پاکی کے مسائل میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں عموماً اختصار سے کام لیا جاتا ہے لیکن لائق مصنف جس ذمہ داری اور قابلیت سے اس مشکل مقام سے گزرے ہیں اس کی داد جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے دی ہے، اس سے بڑھ کر داد اور کیا ہوسکتی ہے، مسائل کے بیان میں فقہ وفتاوی کی ایک مخصوص زبان ہوتی ہے، کتاب کی بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ زبان بہت آسان ہے اور صرف بیان مسائل ہی نہیں اسلام کی بلند و پاکیزہ معاشرتی تعلیمات کی تبلیغ وتلقین بھی بڑی حکمت سے آگئی ہے، اپنے موضوع پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ بہترین اور جامع ترین کتاب ہے اور یہ ہر گھر کی ضرورت ہے۔

دعوت دین، اہمیت اور طریقہ کار: از جناب مولانا سید احمد ومیض ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۹۶، قیمت: ۱۲۰ روپے، پتہ: مکتبہ سبیل الفلاح ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر ایسوسی ایشن، نزد یونیک ہائی اسکول، واحد نگر، قدیم ملک پیٹ، حیدرآباد، اے پی۔

دین کی دعوت کی اہمیت مسلم ہے، ہر دور کے تقاضوں کے تحت اسلام کے داعیوں نے اس فریضے کو بحسن وخوبی انجام دیا لیکن عصر حاضر میں امکانات ومواقع کے باوجود ملکوں اور قوموں کے ذوق ومزاج کے فرق واختلاف کی وجہ سے دعوت کا طریقہ کار اور وسائل وذرائع کا استعمال، بڑی حکمت، بصیرت اور موعظت حسنہ کی اصل حقیقت سے واقفیت کا متقاضی ہے، دین کے اس نہایت اہم شعبے کے متعلق یہ احساس غلط نہیں کہ عبادات اور معاملات پر تو اہل فکر و نظر کی زبان وقلم نے کوتاہی نہیں کی لیکن دعوت دین سے اس درجہ اعتنا نہیں کیا گیا، کچھ کتابیں ضرور ہیں اور مفید بھی ہیں، تاہم موضوع کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے مزید کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے، یہ کتاب اس ضرورت کو بہ حسن وخوبی پورا کرتی ہے۔

ع ـ ص